ہمزلف

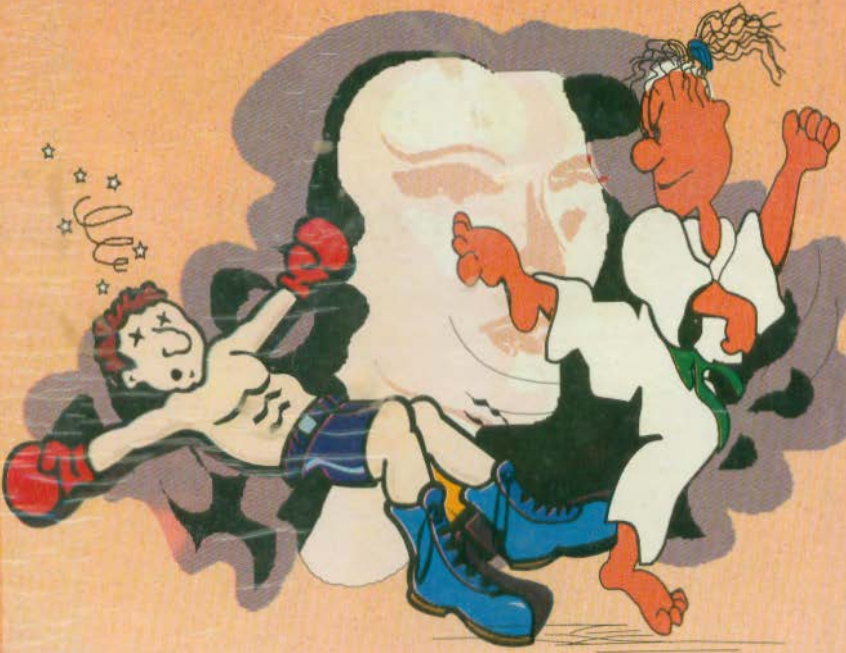

شوکت تھانوی

ہم زُلف

شوکت تھانوی

C-20- جیوتی کالونی، لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی- 110032

Ham Zulf
By.: Shoukat Thanvi
Aam Edition Price :
Library Edition Price : Rs. 110/=
Edition : 2002
RAHI KITAB GHAR
C-20, Jyoti Colony, Loni Road,
Shahdara, DELHI-110032

Sole Distributors -
KITAB WALA
2794, Gali Jhot Wali,
Pahari Bhojla, DELHI-110006
Ph.: (O)328 1499, (R)2293249

نام کتاب : ہم زلف
مصنف : شوکت تھانوی
سن اشاعت : ۲۰۰۲ء
قیمت (عام ایڈیشن) :
لائبریری ایڈیشن : =/۱۱۰ روپے
مطبوعہ : فائن آفسیٹ پریس، شاہدرہ، دہلی۔ 32
ناشر : راہی کتاب گھر، C-20۔ جیوتی کالونی،
لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی۔ 110032

فہرست

تعزیت ۹
چالیسواں ۲۳
ہم زلف ۳۵
آرام کرسی ۴۲
گھاگرا پار ۴۷
بیوی کا پروپگینڈا ۶۶
تار کا منی آرڈر ۷۸
امرود کا چور ۹۱
بوا جعفری خانم ۹۹
پکچر پیلس ۱۱۲

برقعہ ۱۱۸
جی ہاں ۱۲۷
علاج بالغذا ۱۳۹
پان ۱۴۲
عشق کی گولیاں ۱۵۰
بہن بھائی ۱۷۵
بسم اللہ اللہ اکبر ۱۸۵
سگریٹ ۱۹۹
قطع کلام ۲۰۶
شامت ۲۱۵

تعزیت

ریاض کے والد بزرگوار نے انتقال فرما کر ایک عجیب سوال پیدا کر دیا تھا کہ والدین کو اولاد کا غم شدت کے ساتھ ہوتا ہے یا اولاد کو والدین کا غم؟ ماشاء اللہ ایک سو پانچ یا ایک سو چھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا تھا۔ لیکن ریاض کا یہ حال تھا کہ مچھلی کی طرح تڑپتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوان اولاد کا داغ کھایا ہے۔ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ اگر اولاد اپنے والدین کا غم منانے پر تل جائے تو والدین کا داغ بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ بیٹے یا بیٹی کے مرنے سے والدین یتیم نہیں ہوتے۔ لیکن باپ کے مرنے سے اولاد یتیم خانے میں داخل کر دی جاتی ہے اولاد کے مرنے کے بعد انسان اپنی دوسری اولادوں کو دیکھ کر صبر کر لیتا ہے ورنہ کم سے کم یہ امکان تو ضرور ہوتا ہے کہ خداوند کریم اور دے گا۔ لیکن

سوال تو یہ ہے کہ ریاض بیچارے اپنے لیئے والد کا انتظام کیوں کر کرتے۔ ان کو تو یہی غم تھا کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو بغیر باپ کے رہنا پڑے گا۔ ماں کے غم سے وہ واقف نہ تھے۔ اس لیے کہ وہ غریب ان ہی حضرت کی پیدائش کے سلسلے میں دنیا سے کوچ کر چکی تھیں اور ان کو ان ہی ایک عدد مرحوم والد بزرگوار نے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا تھا۔ لہٰذا ان کی ماں تھے تو وہی اور باپ تھے تو وہی جن کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیشہ کے لیے ان سے جدا کر دیا تھا۔

ریاض کے والد ماجد کا انتقال خود ان کے لیے تو غم کا پہاڑ پھٹ پڑنے کے برابر تھا لیکن اس سلسلے میں ہم بھی کچھ کم مصیبت میں مبتلا نہ تھے اس لیے کہ بحیثیت دوست کے ہم کو ریاض کے پاس جانا تھا۔ ان سے اظہار ہمدردی کرنا تھا۔ جنازہ میں عدم شرکت کے عذر کرنا تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہم اس سے قطعاً ناواقف تھے کہ ہم کو اس سلسلہ میں کیا کیا کرنا ہوگا۔ زندگی بھر میں پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی تھی اور وقت اتنا تھا نہیں کہ ہم تعزیت کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچا کر تھوڑی بہت مشق کر لیں۔ بہر حال ہم کو اتنا اطمینان تو تھا ہی کہ ہم بالکل کورے ثابت نہ ہوں گے۔ اس لیے متعدد مرتبہ لوگ ہمارے پاس تعزیت کے لیے آ چکے تھے اور متعدد مرتبہ ہم نے دوسروں کو بھی آپس میں یہی مشکل کام انجام دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر چہ کچھ ہم کو جھجک

تھی تو صرف اس لیے کہ خود ہم نے بہ نفس نفیس آج تک یہ رسم ادا نہ کی تھی لیکن اس سے کیا ہوتا ہے جانا تعزیت کرنا تقریباً ناگزیر تھا۔ لہٰذا ہم نے اللہ کا نام لے کر اپنے ارادہ کو پختہ کر لیا اور مختلف اوقات میں جو تعزیتی الفاظ ہمارے کانوں میں پڑ چکے تھے۔ ذہن پر زور دے کر یکجا کرنے شروع کر دیے۔

"مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے..... صبر کیجیے..... جس کی چیز تھی اس نے لے لی..... دنیا کا یہی دستور ہے.... مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے.... کیا ملیل ہوئے تھے... ہم کو بھی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے.... آج وہ کل ہماری باری ہے.... خدا بخشے عجیب انسان تھے.... دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے..... کوئی نشانی بھی چھوڑی ہے..... "ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد": ..... مگر صبر کیجیے..... اب رونے سے کیا فائدہ.... ہر ایک پہ دن آنے والا ہے.... دنیا سرائے فانی ہے.... کیا اخلاق تھا مرحوم کا ہر ایک خوش.... کبھی نماز قضا نہیں کی.... خدا نعم البدل دے گا..... اپنے سینے کو سنبھالیے.... صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے..... حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے..... بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں.... ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن الٰہی عاقبت محمود گرداں.... چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔

ہمارے پاس تعزیتی الفاظ کی کمی نہ تھی۔ لیکن آسان سے آسان کام جب تک انسان کر نہ لے اس کے لیے مشکل بنا رہتا ہے۔ بہرحال اب تو ہم کو اس دشواری سے دوچار ہونا ہی تھا۔ لہٰذا ہم نے ان الفاظ کو ترتیب وار دماغ میں محفوظ کر لیا اور ان کی مشق کرنے کے بعد ہم "ایکسپرٹ" ہو گئے۔ تو نصف اطمینان اور نصف بے اطمینانی کے ساتھ گھر سے اس طرح چلے، گویا یونیورسٹی کے کسی امتحان میں بیٹھنے کے لیے جا رہے ہیں۔ تمام راستے بھر تعزیتی الفاظ رٹتے رہے اور آخرکار ہماری تعزیتی تقریر کچھ اس طرح تیار ہو گئی۔

"مجھ کو تو کل اطلاع ہوئی، واللہ دل کو یقین نہیں آتا۔ عجیب سانحہ ہے عجیب حادثہ ہے۔ خداوند کریم آپ کو صبر دے اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ کیا علیل تھے؟ ہر ایک خوش، کبھی نماز قضا نہیں ہوئی۔ بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں، صبر کیجیے کیا اخلاق تھا مرحوم کا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ آپ کی قسمت میں یہ غم لکھا تھا...... حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔ جس کی چیز تھی اس نے لے لی۔ جائے ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد"...... صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ روحیں آزاد نہ ہوں جسم جو برباد نہ ہوں۔ ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن مر گئے تو سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ وہ تو جنت کا ایک پھول تھے...... [illegible]

کی گود میں ہوں گے۔ نمازی، پرہیزگار، خوش وضع، خوش اخلاق، دوست نواز غریب پروردہ، نیک، اچھے، فرشتہ صفت، محبت کرنے والے، لائق، پڑھے لکھے، فخرِ خاندان، مختصر یہ کہ خدا آپ کو صبر کی توفیق دے۔ خدا آپ کو نعم البدل عطا فرمائے، خدا آپ کا غم غلط کرے۔ مجھ کو اطلاع ہوتی تو شاید کچھ کام آتا...... مٹی دینے میں شرکت کرتا، نماز جنازہ میں شریک ہو جاتا مگر افسوس کہ آج وہ کل ہماری باری ہے۔" چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ السلام علیکم۔

ریاض کے دروازہ پہ پہنچ کر ارادہ ہوا کہ "خط لے جلیئے" کی آواز دیں لیکن یاد آ گیا کہ موقع غم کا ہے۔ فوراً اپنا چہرہ اداس بنا لیا اور مری ہوئی آواز میں بولا "ریاض صاحب تشریف رکھتے ہیں؟" آواز کے ساتھ ہی ملازم برآمد ہوا اور ہم کو اپنے ہمراہ گھر میں لے گیا جہاں ایک کمرے میں ریاض اوڑھے لپیٹے پڑے تھے۔ ہم نے مضمحل آواز میں کہا۔

"السلام علیکم"

انہوں نے اس کے جواب میں "وعلیکم السلام" کہہ کر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ہمارا بھی دل بھر آیا لیکن یہ موقع ہمارے رونے کا نہ تھا ہم تعزیت کے لیے آئے تھے۔ لہٰذا ہم کو جلد سے جلد اپنی تعزیتی تقریر شروع کرنا تھی۔ ہم نے جلد جلد دل ہی دل میں تقریر دہرانا شروع کی لیکن ریاض رو رو کر کچھ ایسے ہاتھ پیر پھیلائے دیتا تھا کہ ہم اپنی تقریر بھولے جا رہے

تھے۔ ہم لاکھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اس کی ہر ہچکی خیالات منتشر کر دیتی تھی اور ہم پھر شروع سے تقریر یاد کرنے لگتے تھے جب اس میں بڑی دیر ہو گئی تو ہم نے اپنی خاموشی پر غور کیا کہ یہ تو بڑی بُری بات ہے کہ وہ روتے روتے جان دیئے دیتا ہے اور ہم چپ بیٹھے ہیں۔ مجبوراً ہم نے طے کر لیا کہ کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہئے جو اس خاموشی سے یقیناً بہتر ہوگا لیکن سوال یہ تھا کہ کیا کہیں۔ کہنے کو تو ہم سب کچھ کہہ سکتے ہیں بس بات شروع کرنے کی دیر تھی۔ لہٰذا یہی سوچ رہے تھے کہ شروع کس طرح کریں۔ چونکہ یہ بھی ایک اہم مسئلہ تھا لہٰذا اس پر غور کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا اور ہم نے جو حساب لگایا تو یہ غور و فکر کا وقت اور وہ غور و فکر اور تقریر یاد کرنے کا عرصہ اپنی میزان کل پر آکر آدھے گھنٹے کے قریب ہوتا تھا۔ ہم نے کہا۔ لاحول ولا قوت یہ بھی کوئی بات ہے کہ تعزیت کے لیے گئے ہیں اور آدھے گھنٹے سے بت بنے بیٹھے ہیں۔ لہٰذا دماغ پر زور دے کر تعزیتی الفاظ کو از سرِ نو یاد کیا اور آنکھیں بند کر کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”آپ کے والد صاحب .....“ پھر سوچا کہ اب کیا کہیں، کچھ یاد آگیا تو عرض کیا۔

”آپ کے والد .....“ ہم کو خود یاد نہیں رہا کہ ہم کو کیا یاد آیا تھا۔ مگر ٹھیک ہے وہ بات یہ تھی کہ .....“

”آپ کے والد .... آپ کے والد .... آپ کے والد ....“ خدا جانے ہم کیا کہنا چاہتے تھے، دماغ میں جیسے کم بخت گوبر بھرا تھا۔ آخر دماغ نے کام نہ دیا لیکن مناسب یہی معلوم ہوا کہ کچھ کہہ چلو۔ لہٰذا ہم نے پھر کہنا شروع کیا۔

”آپ کے والد ... آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔“

ریاض نے سنتے ہی پھر ایک چیخ ماری گویا اس کو انتقال کی خبر میں نے ہی سنائی ہے۔ میں پھر خاموش ہو گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھ کو یاد آیا کہ مجھ کو خاموش نہ ہونا چاہیئے تھا لہٰذا میں نے جلد جلد کہنا شروع کیا۔

”آپ کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے والد مرحوم کو خدا صبر کی توفیق دے اور آپ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ کبھی نماز قضا نہیں ہوتی، زندگی بھر روزے رکھتے رہے آپ کے والد مرحوم مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ صبر کیجئے۔ اب رونے سے کیا ہوتا ہے اور آپ کے والد ... آپ کے والد ... آپ کے والد ... آپ کے والد ... جس پہ گذری ہو یہ وہی جانے مگر اب نہ روئیے ... جانے بھی دیجئے۔ ہٹائیے بھی اس قصے کو ..... آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔“

میری تقریر سے ریاض کو تسکین ہو رہی تھی۔ وہ روتے روتے خاموش ہو گیا تھا اور گردن جھکائے بیٹھا خاموشی کے ساتھ میرے الفاظ سن رہا تھا بلکہ کبھی کبھی میرے بعض زوردار الفاظ پر گردن اٹھا کر میرے منہ کو

بھی دیکھ لیتا تھا۔ اب میرے بھی حواس درست تھے اور میں نہایت مناسب طریقہ پر تعزیتی تقریر کر رہا تھا۔ میں نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ماں باپ بھی دنیا میں عجیب نعمت ہے۔ بہت سے بے چارے اس ارمان میں مر جاتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر خدا دے تو زندگی کاٹے نہیں تو اس کا نہ ہونا ہی اچھا ہے۔"

ریاض برابر میرا منہ دیکھے جا رہا تھا لیکن میرے اس جملے کا اس پر خاص اثر ہوا اور اس نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر میرے چہرے پر جما دیں۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ کھنکھار کر پھر کہنا شروع کیا۔

"اب وہ واپس تو نہیں آ سکتے۔ مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ ہم کو بھی ایک دن اسی طرح تصویر کھچانا یعنی ایک دن اسی راہ پر جانا ہے۔ خدا بخشے عجیب انسان تھے۔ دل کو یقین نہیں آتا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ مجھ کو تو کل خبر ہوئی۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ ورنہ مجھ کو اطلاع ہوتی تو میں کچھ کام آتا اور بفرض محال یعنی یہ کہ مٹی میں شرکت ہو جاتی۔ نماز جنازہ تو ضرور ہوئی ہو گی۔"

ریاض نے منحنی آواز میں جواب دیا۔

"جی ہاں فرنگی محل میں مولانا عنایت اللہ صاحب نے پڑھائی تھی۔"

میں:۔ "خیر یہ بھی اچھا ہوا اور خدا آپ کو ضرور صبر دے گا اور قبر کا کیا ہوا ہو گا؟"

ریاض:۔ "عیش باغ کے نئے چمن میں مناسب جگہ لے لی تھی۔"

میں:۔ "ہاں واقعی اور تم بے چارے کیا کرتے تمہارے حواس خود ٹھیک ہوں گے۔ دنیا سرائے فانی ہے، کیا اخلاق تھا مرحوم کا اور بیماری کیا تھی؟"

ریاض:۔ "ارے بیماری کیا ضعیفی خود ایک مستقل بیماری ہے۔"

میں:۔ "ہاں، بڑی مہلک بیماری ہے۔ خدا سب کو محفوظ رکھے ہمارے بھائی صاحب کا چھوٹا بچہ اسی میں ضائع ہوا۔ کم بخت اب تو عالمگیر ہوتی جاتی ہے۔ غم کا پہاڑ پھٹ پڑا۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں اور مرحوم نے کوئی نشانی بھی چھوڑی۔"

ریاض:۔ "ایک تو میں ہی ہوں۔"

میں:۔ "(جلدی سے) تم تو خیر ہو ہی مگر میں نے کہا شاید اور بھی ہوں ایسے ہاں کیا تعجب ہے؟"

ریاض:۔ "جی ہاں دو بھائی اور ایک بہن اور ہے۔"

میں:۔ "وہی مطلب ہے میرا۔ اور ان کی بیوہ کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے نا؟"

ریاض:۔ "جی ہاں۔ میری والدہ تو عرصہ ہوا یعنی میری پیدائش کے وقت ہی انتقال کر گئیں تھیں اور میری دوسری والدہ بھی چھ سال ہوئے رحلت فرما گئیں جن کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔"

میں:۔ "اُن کے انتقال کا بھی سخت افسوس ہوا مگر مشیت ایزدی میں کیا چارہ، صبر کیجئے اور آپ کے والد ماجد کی ماشاءاللہ کیا عمر تھی؟"

ریاض:۔ "سو سے کوئی پانچ چھ سال اوپر تھے۔"

میں:۔ "افسوس صد افسوس۔ ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔"

ریاض نے مجھ کو کچھ اس نظر سے دیکھا جیسے میں دنیا داری کر رہا ہوں اور یہ سب تصنع ہے مگر میں نے مؤثر انداز میں کہا۔

"خدا گواہ ہے کہ چچا جان مرحوم مجھ کو بھی بالکل آپ ہی کی طرح سمجھتے تھے اور محبت کرتے تھے۔"

ریاض:۔ "جی ہاں ان کا ہر ایک کے ساتھ یہی سلوک تھا۔"

میں:۔ "ارے بھائی! میں نہ جانتا ہوں تو مجھ سے کہو۔ میں تو یہ کہتا ہوں خدا ایسا لائق باپ ساری دنیا کو دے ہر ایک خوش کبھی نماز قضا نہیں کی۔ ابھی تو نہ تھے ان کے مرنے کے دن۔ خدا جانے کس کی نظر کھا گئی تو سب سے بڑے آپ ہیں۔"

ریاض:۔ "جی ہاں، اب تمام ذمہ داری میرے ہی سر ہے۔"

میں:۔ "گھبرائیے نہیں۔ جس خدا نے ان کو اٹھایا ہے۔ وہی آپ کی ذمہ داریوں کو بھی پورا کرے گا۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ عجب ذات شریف تھے!

مرحوم کبھی نماز قضا نہیں کی خود ان ہی کی قضا آگئی۔ ع

این ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

دنیا کا یہی دستور ہے۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے اور آپ کی شادی تو ہو چکی ہے نا؟

ریاض: جی ابھی تو نہیں ہوئی۔

میں:۔ (بزرگانہ اور تجربہ کارانہ انداز سے) "بھائی تو اسی سلسلے میں اس فرض سے بھی ادا ہو جاؤ۔"

ریاض:۔ "اس کا یہ کونسا موقع ہے بھلا۔"

میں:۔ "تو اب اور کونسا موقع آئے گا؟"

ریاض:۔ "اب خوش ہونے والا کون ہے۔ جو تھے وہی نہیں رہے تو اب کیا ہوگی شادی۔"

میں:۔ ہاں یہ تو سچ کہتے ہو کہ چچا جان مرحوم کو چاہئے تھا کہ اس خوشی کو دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوتے مگر بھائی خوش ہونے والے ہم لوگ موجود ہیں۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے جس کی چیز تھی اس نے لے لی مگر بھائی شادی میں اب دیر نہ کرو۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

خدا جانے کل کیا ہونے والا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ع

ساماں سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں۔

اب دیکھو نا چچا میاں مرحوم کو بے چارے آخر کیا بیمار تھے یہی نا کہ بس قضا آگئی ورنہ کہیں مرنے کے آثار تھے؛ کسی کو شبہ بھی ہوتا کہ مر جائیں گے مگر خدا کی مصلحت اور تم پر تو وہ جان دیتے تھے اب تم کو کون اس طرح چاہے گا۔ تمہارا محبت کرنے والا اٹھ گیا، تم یتیم ہو گئے۔ تم سے والدین کا سایہ اٹھ گیا ع۔

دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے۔

ریاض نے پھر ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا اور میں گھبرایا کہ اب کس طرح سمجھاؤں، تمام الفاظ ختم ہو چکے، کیا ان ہی کو پھر شروع کر دوں لیکن اگر انہوں نے پھر رونا شروع کیا تو کیا ہوگا۔ آخر کار دل نے کہا بس اب بھاگو ورنہ یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا مگر دل نے دوسری بات کہی کہ اس طرح روتے ہوئے دوست کو نہ چھوڑو۔ لہٰذا ہم نے کہا۔

“بھائی رونے کے لیے تو تمام عمر پڑی ہے اور انشاء اللہ تم سینکڑوں برس تک زندہ رہ کر روتے رہو گے مگر یہ وقت رونے کا نہیں ہے تم کو سمجھ سے کام لینا چاہیے۔”

ریاض کی ہچکیاں سسکیاں بن گئیں اور سسکیاں بھی تھوڑی دیر کے بعد بند ہو گئیں تو میں نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ “اچھا بھائی

اب اجازت دو۔”

ریاض نے کہا۔ “جائیے گا۔”

ہم نے کہا۔ “ہاں! السلام علیکم”

ریاض کے یہاں سے آکر مجھ کو پورا اطمینان تھا اور اب میں دعوٰی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس کے یہاں کہیے تعزیت کے لیے روز چلا جایا کروں۔

چالیسواں

اس کو صرف وہی لوگ سمجھتے ہیں جن کا اکلوتا باپ داغِ جدائی دے جائے کہ باپ کا غم اس اولاد کو کس قدر ہوتا ہے کہ جس کے ایک ہی باپ ہو اور وہ بھی موت کے بے رحم ہاتھوں اس سے چھین لیا جائے ہم تو کہتے ہیں کہ خداوند کریم ہر ایک کو اس " والدین غم " سے محفوظ رکھے بخدا جس دن سے ریاض کی یتیمی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود ہمارا کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ اس غریب کا تو جو کچھ بھی حال ہو کم ہے۔ وہ تو کہیے کہ میں نے بروقت پہنچ کر کچھ اس مؤثر طریقہ پر تعزیت کی تھی کہ اس کے کچھ آنسو پونچھ گئے تھے ورنہ خدا جانے وہ اپنا کیا حال کر لیتا لیکن اس کے باوجود اس کی حالت اب بھی

دیکھی نہیں جاتی تھی چنانچہ وہ غریب میرے پاس عجیب عالم میں آیا اور ایک طرف گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا کہ کہو بھائی ریاض اچھے تو ہو۔ اس پر اس نے نہایت ہی افسردہ طریقہ پر کہا۔

"کیا اچھے ہیں بھائی صاحب والد مرحوم تو ہم کو کسی کام کا نہیں چھوڑ گئے۔"

ہم نے جواب دیا "واقعی انہوں نے تم کو لاڈ پیار میں نہ پڑھایا نہ لکھایا اور نہ کوئی دست کاری ایسی سکھائی کہ چار پیسہ کما سکتے تم جو یہ کہتے ہو دنیا میں کسی کام کا نہیں چھوڑ گئے تو سچ کہتے ہیں مگر بھائی خدا مسبب الاسباب ہے تمہارے لیے بھی غیب سے کوئی نہ کوئی سامان ہو ہی جائے گا۔ تم مایوس نہ ہو۔ بس خدا پر بھروسہ رکھو۔"

وہ :۔ یہ مطلب نہیں ہے میں تو یہ کہتا ہوں کہ انہوں نے مر کر ایسا دل توڑا ہے کہ اب دنیا سے دل پھر گیا۔

ہم :۔ تم کہتے ہو دل پھر گیا۔ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارا دماغ بھی پھرا ہوا سا معلوم ہوتا ہے مگر بھائی دل کو بھی سنبھالو اور دماغ کو بھی نماز پڑھا کرو، شادی کرلو، بچے ہوں گے اور تم خود باپ بن جاؤ گے۔

وہ :۔ خیر ان باتوں کی طرف تو اب دھیان بھی نہیں جاتا اب تو یہ دعا کیجیے کہ ہم بھی انہیں کے پاس پہنچ جائیں۔

ہم :۔ تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے لیئے دعا نہیں کرتا۔ بخدا ریاض حاضر غائب تمہارے لیئے دل سے دعا نکلتی ہے۔

وہ :۔ میں اس وقت اس لیے حاضر ہوا تھا کہ بارہ تاریخ کو چالیسواں ہے آپ کو اطلاع کر دوں۔

ہم :۔ ارے بھائی اس میں اطلاع کرنے ہی کی کونسی بات تھی۔ ہم تو خادم ہیں بسر و چشم حاضر ہوں گے اور جو خدمت ہمارے لائق ہو ہم دل و جان سے حاضر ہیں۔

وہ :۔ بس آپ کے لائق خدمت یہی ہے کہ بھولیئے گا نہیں اور اب مجھے اجازت دیجیے۔

کمال ہے بھئی کیا ہم بھول سکتے ہیں۔

کہتے ہوئے ہم بھی کھڑے ہو گئے اور ریاض بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم نے اس کو رخصت کیا اور اس کے بعد ہی سے ہم کو چالیسویں کی فکر پیدا ہوئی کہ یہ دعوت تو ہم نے قبول کر لی مگر ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ چالیسویں میں کیا ہوتا ہے اور ہم کو شریک ہو کر کیا کرنا چاہیئے۔ لیکن پھر ہم نے خود ہی سوچا کہ تعزیت سے بھی ہم بالکل اسی طرح بے بہرہ تھے لیکن جس حسنِ خوبی کے ساتھ ہم نے اس فرض کو انجام دیا ہے اگر کوئی دیکھتا تو یہی کہتا کہ شاید ہم عمر بھر بس تعزیت ہی کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح انشاءاللہ چالیسویں کو بھی

مشکل آسان ہو جائے گی جب تک انسان کوئی کام نہیں کرتا ہے۔ اس کو بہت دشوار معلوم ہوتا ہے لیکن جہاں سابقہ پڑا کہ سب کچھ خود بخود آسان ہو جاتا ہے۔

اب یہی دیکھئے نا کہ تعزیت کرنا ہمارے لیے کس قدر مشکل کام تھا لیکن آج ہم ہیں کہ اس سے زیادہ آسان کام اور کوئی سمجھتے ہی نہیں۔ اسی طرح چالیسواں ہمارے لیئے اسی وقت تک ایک دشوار مرحلہ ہے جب تک کہ ہم سے وقت گذر نہ جائے اس کے بعد تو پھر جس طرح تعزیت حلوہ ہو کر رہ گئی۔ چالیسواں بھی بائیں ہاتھ کا کھیل بن کر رہ جائے گا لیکن ایک سوال تھا کہ تعزیت کے لیئے ہمارے پاس پہلے سے کچھ مواد موجود تھا۔ تعزیتی الفاظ کانوں میں پڑے ہوئے تھے بس ان کو ترتیب وار بیان کر دینا تھا

اور بہت سے تعزیتی الفاظ ان خطوط سے دستیاب ہو سکے جن سے کچھ حاصل کیا جا سکتا۔ بس ہم کو اتنا معلوم تھا کہ اس دن بھی عام تقریبوں کی طرح دعوت ہوتی ہے۔ لوگ پلاؤ کھاتے ہیں اور اپنے گھر چلے آتے ہیں مگر دل کہتا تھا کہ پلاؤ کھانے کے علاوہ کچھ اور لوگوں کو کرتا ہوا دیکھیں گے وہی ہم بھی کریں گے۔ اس سے زیادہ ہمارے امکان میں کچھ اور نہ تھا۔

چالیسویں کو پورا پورا ایک ہفتہ باقی تھا اور یہاں یہ حال نہ تو کوئی شیروانی اس قابل کہ کسی تقریب میں پہن کر جا سکیں نہ جوتا ایسا تھا کہ شرفاء

کی محفل میں جانے کے قابل ہو اور پھر یہ معلوم تھا کہ ریاض کے یہاں کی محفل کیسی ہوگی۔ تمام بڑے بڑے رئیس اور حکام شرکت کریں گے۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ ایک شیروانی کا انتظام ہو جائے اور ایک جوتا خرید لیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک شیروانی کا کپڑا جو شادی، بیاہ، چالیسویں، روزہ کشائی وغیرہ میں کام آسکے اور اسی قسم کی تقریبوں میں پہن کر جانے کے لائق ہو۔ خریدا اور درزی کو دے دیا۔ اس کے بعد ایک وارنش کا پمپ مع ریشمی موزوں کے خرید لائے۔ سرخ رنگ کا ریشمی رومال موجود ہی تھا۔ لہٰذا حسب ضرورت تمام چیزوں کا انتظام ہو گیا۔ اور اس انتظام سے فارغ ہونے کے بعد ہم کو چالیسویں کا اسی طرح انتظار رہنے لگا جس طرح عید کے کپڑے درست ہونے کے بعد لوگوں کو عید کا انتظار ہوتا ہے تاکہ کسی طرح یہ کپڑے پہن کر ان کو کام میں لے آئیں۔ ہر روز دن میں ایک آدھ مرتبہ اپنے جوڑے کو دیکھ کر یہ اطمینان کر لیتے تھے کہ چالیسویں کی محفل میں سب ہم ہی ہم ہوں گے اور سچ پوچھیے تو اسی مقصد کے لیے ہم نے اپنی اہم ضروریات کو ٹال کر یہ جوڑا تیار کرایا تھا۔ البتہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ریاض کے والد کے چالیسویں میں ہم کسی سے پیچھے نہ رہیں اور اگر ہم ہی ہم رہے تو دام وصول ہو جائیں گے۔

انتظار کی گھڑیاں گو مشکل میں گزرتی ہیں لیکن گزرتی ضرور ہیں۔ ہم کو چالیسویں کا انتظار صرف چار ہی پانچ روز کرنا پڑا مگر معلوم ہوتا تھا کہ چار پانچ برس

سے اس دن کے منتظر ہیں۔ چنانچہ چالیسویں کے دن ہم طلوع آفتاب سے قبل بیدار ہو کر شرکت کے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ سب سے پہلے تو چراغ رکھ کر داڑھی کو صاف نہیں کیا۔ بلکہ گھسوٹا اور اس کے بعد پیرس سوپ مل مل کر خوب نہائے اور کپڑے بدلے، عطر لگایا۔ بال سنوارے کریم وغیرہ سے چہرے پہ پالش کی اور پھر شیروانی اور چمک دار پمپ کو پہن کر ریشمی رومال ہلاتے ہوئے اس طرح چلے، گویا ریاض کے باپ کا چالیسواں نہیں بلکہ ہماری شادی تھی۔ بات یہ تھی کہ ہم جانتے تھے کہ ریاض کے یہاں بڑے بڑے لوگ شرکت کریں گے اور اس محفل میں ہم کو بھی کسی سے کیا کم نہ رہنا چاہیے۔ چنانچہ ہم نے کرایہ کے موٹر پر سوار ہو کر ریاض کے گھر کا رخ کیا اور ریاض کے دروازے تک پہنچنے سے قبل ہی موٹر والے کو اس لیے کرایہ دے دیا کہ وہاں کرایہ دیتا دیکھ کر لوگ سمجھ جائیں گے کہ کرایہ کا موٹر ہے لیکن افسوس یہ ہے جس وقت ہمارا موٹر ریاض کے دروازے پر پہنچا وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا جو ہم کو موٹر پر سوار اور موٹر سے اترتا دیکھتا۔ اسی انتظار میں ہم نے موٹر ٹھہرنے کے بعد بھی دو چار منٹ اسی پر تشریف رکھا لیکن جب موٹر والے نے جلدی کی تو مجبوراً گردن جھکا کر اترنا ہی پڑا اور ہم نہایت تمکنت دارانہ انداز میں ریاض کے گھر میں داخل ہوئے جہاں اتفاق سے ریاض کے مکان کے بڑے ہال میں جھاڑو دی جا رہی تھی۔ ہم سمجھے کہ شاید چالیسویں کے لیے ریاض نے کوئی علیحدہ مکان لیا ہے یا کوئی پنڈال وغیرہ بنوایا ہے لیکن ریاض نے جو جاروب

شوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ "آئیے آئیے" کہہ کر ہم کو وہیں بلا لیا اور ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے اچھا کیا جلدی چلے آئے بہت کام نکل جائے گا۔"

ہم نے بھی سوچا کہ احسان جتانے کا اچھا موقع ہے برجستہ عرض کیا۔

"مجھے خود معلوم تھا کہ تم تنہا انتظام نہ کر سکو گے لہٰذا میں آ گیا ہوں لہٰذا اب بتاؤ کہ نشست کا کیا انتظام کیا ہے اور کھانا کہاں کھلاؤ گے محفل کہاں ہوگی؟"

ریاض: "نشست بھی اسی ہال میں ہوگی اور کھانا اس کے پشت والے کمرے میں کھلاؤں گا۔ ابھی ہم آپ مل کر اس کو صاف کرائے لیتے ہیں۔"

"ابھی ہم آپ مل کر اس کو صاف کرائے لیتے ہیں۔" یہ جملہ ہمارے لئے قابل غور تھا اور اس کے معنی یہ تھے کہ گویا ہماری شیروانی ہمارا جوتا ہمارے موزے وغیرہ سب اسی صفائی کے نذر ہو جائیں گے۔ ارادہ کیا کہ آنکھ بچا کر گھر کی راہ لیں مگر ہمت نہ ہوئی پھر سوچا کہ پیروں میں درد یا ہاتھ میں زخم وغیرہ کا بہانہ کریں مگر بہانہ تراشنے سے قبل ہی ریاض نے کہا۔

"تو چلئے اس کمرے کی خبر لیں۔"

اور ہم کو مجبوراً اس کے ساتھ جانا ہی پڑا اور ہم نے حواس بحال رکھ کر پہلے تو شیروانی اتار دی پھر جوتے احتیاط سے رکھ کر موزے اتار ڈالے اور بعد اطمینان کے ساتھ کمرے کی صفائی میں مصروف ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر میں کمرہ صاف کر

کے درست کر دیا گیا۔ ادھر ہال ٹھیک ہو چکا تھا اور لوگ آنا شروع ہو گئے لہٰذا ہم نے سب سے پہلے تو ہاتھ منہ دھویا اور پھر اپنا جوڑا پہن کر ہال میں اس طرح آ کر بیٹھ گئے گویا اب قاضی صاحب ہم سے "قبول ہے" دریافت کرنے والے ہیں۔ تمام محفل کی نظریں ہماری طرف تھیں اور ہم کو احساس ہو رہا تھا کہ "شیروانی رنگ ہماری ہے" مگر ساتھ ساتھ ہی افسوس بھی تھا کہ فرشی محفل میں ہمارے جوتے کو رنگ جمانے کا موقع نہیں ملا۔ لوگ ہماری طرف دیکھ کر آپس میں یہ سرگوشیاں بھی کر رہے تھے۔ "دیکھئے یہ شخص کتنا نیک مزاج ہے کہ ہمارے ایسے پست اقوام کے لوگوں میں بیٹھا ہوا ہے اور اپنے عالی مرتبہ ہونے کا ذرا بھی غرور نہیں۔" بعض لوگ ہماری سادگی پر تبسم فرما رہے تھے لیکن ہم جانتے تھے کہ سب کچھ ہماری شیروانی کی بہار ہے اور افسوس ہے کہ لوگ یہ جوتا نہیں دیکھ سکتے۔ کاش یہ کرسیوں کی محفل ہوتی۔

لوگ آتے جاتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد بیٹھنے کے بعد کھانے کے کمرے میں بلائے جاتے تھے مگر ہم اب تک یہی دیکھ رہے تھے کہ کھانے اور کھانے کے علاوہ یہ لوگ اور کون سی بات کرتے ہیں جو ہم کو نہیں معلوم ہے اور جو ہم کو بھی ان سے سیکھ کر کرنا چاہیئے مگر معلوم ہوا کہ چالیسویں کے معاملہ میں سب ہماری طرح جاہل مطلق ہیں۔ یہاں تک ہم نے شروع سے آخر تک ایک شخص کی نقل و حرکت کا غائر مطالعہ کیا مگر کوئی بات غیر معمولی سمجھ میں نہ

...... آئی آخر ہم بھی آخری ٹکڑے کے ساتھ دسترخوان پر پہنچ گئے۔ اور نہایت اطمینان کے ساتھ کھانا کھانے سے فراغت کر کے ایک پرانی وضع کے بڑے میاں کے ہمراہ محض اس لیے ہو گئے کہ یہ بزرگ آدمی ہیں تمام عمر چالیسویں کی تقریب میں شرکت کرتے گزری ہو گی اور ان سے زیادہ چالیسویں کے رسوم سے اور کوئی شاید واقف نہ ہو مگر انہوں نے بھی سوائے اس کے اور کچھ نہ کیا کہ کھانا کھا کر ہاتھ دھو کر خلال کی پان کھایا اور "السلام علیکم" کہہ کر رخصت ہو گئے گویا ان سے بھی کوئی مدد نہ مل سکی اور یہ بھی باوجود اس سن شریف کے بالکل کورے ثابت ہوئے مجبوراً ہم نے بھی طے کر لیا کہ بس چلے جائیں مگر یہ ایک مہمل سی بات تھی۔ اگر ریاض کا مقصد محض کھلانا ہی تھا۔ تو چالیسواں کیوں کیا یوں ہی دعوت کر دیتے لوگ کھانا کھانے آ جاتے بہرحال ہم کو یقین تھا اور یقین کامل تھا کہ کچھ اور ہوتا ضرور ہو گا مگر کیا ہوتا ہو گا۔ اس کا علم نہ تھا ہم اس غور و فکر میں تھے کہ ریاض ہمارے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔

"کہیے بھائی صاحب کوئی خامی تو نہیں رہی۔"

ہم :۔ نہیں بھائی خامی کیسی پلاؤ بھی خوب پکا تھا۔ ایک ایک چاول گلا ہوا تھا۔ شیرمالیں بھی خوب سکی ہوئی تھیں خامی کا کیا سوال ہے؟

ریاض :۔ بات یہ ہے کہ اوّل تو مجھ کو تجربہ نہیں۔ دوسرے حواس ہی بجا

نہ تھے۔ خدا جانے یہ سب کچھ کس طرح کیا؟

ہم :۔ میاں بخدا تم مستحق مبارک باد ہو کہ ماشاء اللہ خوب انتظام کیا اور بڑے حوصلے کے ساتھ اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔

ریاض :۔ یہ سب آپ ہی لوگوں کے قدم کی برکت تھی۔

ہم :۔ نہیں واللہ میں دکھی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ واقعہ ہے کہ تم نے نہایت سیر چشمی سے کام لیا خدا تم کو ہمیشہ یہ خوشیاں نصیب کرے۔

ریاض نے میری تعریف پر متعجب ہو کر میرا منہ دیکھا اور پھر کہنے لگا۔ "خدا نہ کرے کہ ایسی خوشی مجھ کو دیکھنا نصیب ہو، میرا تو کلیجہ بیٹھا جاتا ہے۔

ہم :۔ واقعی سچ کہتے ہو۔ یہ تقریب بھی تمہارے لیے ایک صدمہ ہے اب تم کو ہر وقت چچا جان کا خیال ہوتا ہو گا کہ وہ زندہ ہوتے تو آج کس قدر خوش ہوتے، افسوس کہ ان کی قسمت میں یہ تقریب دیکھنا نہیں لکھی تھی مگر بھائی سچ کہا ہے کسی نے کہ ع

"چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے۔"

وہ :۔ کچھ نہ پوچھئے کہ میرے دل کا کیا عالم ہے کسی وقت بھی والد مرحوم کا خیال ذہن سے نہیں نکلتا۔

ہم :۔ جی یہ اور ستم ہے کہ وہ خود تو سدھار گئے مگر اپنا خیال چھوڑ گئے۔ اب

بتائیے کہ ان کے سدھارنے سے فائدہ ہی کیا ہوا؟ "

وہ:۔ معلوم ہوتا ہے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

ہم:۔ خیر یہ تو اچھا ہے کہ تم کو یہ یقین ہو جائے کہ تمہارے باپ ہی نہ تھے۔ کاش کہ تم ہمیشہ سے بے باپ کے ہوتے۔

وہ:۔ مجھ کو تو گھر کھائے کھاتا ہے مجھ سے یہ ویرانی نہیں دیکھی جاتی۔

ہم:۔ تو اسی لیے کہتا ہوں کہ تم اپنا گھر بساؤ شادی کرو دلہن کو لاؤ۔ باپ تو اب تم کو مل نہیں سکتا اگر یہ بھی کوئی ملنے والی چیز ہوتی تو ایک کیا ہزاروں حاصل کر لیے جاتے مگر اب تو سوائے صبر کے اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم باپ کی جگہ پر دلہن کو لے آؤ۔

وہ:۔ میرا دل اب کچھ نہیں چاہتا۔

ہم:۔ "تو بھائی جو ترکیب تم بتاؤ وہ میں کر دوں۔"

وہ:۔ اسے اب ترکیب ہی کیا ہو سکتی ہے؟ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔

ہم:۔ تم ہی جانو اب جب ایک بات ہو گئی تو جہنم میں ڈالو، بھول جاؤ۔ دوسری طرف دل لگاؤ۔

وہ کچھ آبدیدہ سا ہو گیا اور میں اس خیال سے گھبرایا کہ آج پھر مجھ کو تمام تعزیتی الفاظ دہرانا پڑیں گے مگر فوراً ہی اسے کچھ خیال آ گیا۔ ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "یا اللہ تیرا شکر ہے۔"

اور ہم نے اس کو راہ راست پر آتا دیکھ کر کہا۔

"ہاں بس یہی کہو کہ خدا کا شکر ہے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی طرح تمہارے دل کو صبر آ سکتا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور میں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کس طرح پیچھا چھڑانا چاہیے۔ وہ گردن جھکائے ہوئے رونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور میں بھاگنا چاہتا تھا کہ یکلخت میرے منہ سے نکل گیا۔

"اچھا بھائی ریاض ہم تو اب چل دیے۔"

اس نے "جائیے گا؟" کہا منہ اٹھایا اور ہم اس کو چالیسویں کی مکرر مبارکباد دیتے ہوئے گھر سے نکل آئے اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ چالیسواں تو تعزیت سے بھی زیادہ آسان چیز ہے۔ یعنی بس گئے کھانا کھایا اور چلے آئے۔ اس حساب سے تو گویا ہر دعوت چالیسویں کی دعوت ہو سکتی ہے۔ اگر ہم کو پہلے سے یہ معلوم ہوتا تو ہم خواہ مخواہ ہرگز یہ فکر نہ کرتے کہ خدا جانے چالیسویں میں کیا واردات ہو؟

ہم زلف

"بہرے کہیں کے":

بھرے چوک میں جب کوئی شخص اس بے تکلفی کے ساتھ شانہ پر ہاتھ رکھ دے تو اس کے معنی یہی ہوئے کہ وہ یقیناً اس بے تکلفی کا مستحق ہوگا۔ لیکن ہم سے قسم لے لیجئے جو ہم ان حضرت کو جانتے بھی ہوں جنہوں نے ہم کو بہرہ بھی بنایا تھا اور بھرے بازار میں کندھے پر ہاتھ بھی رکھا تھا۔ ہم تو ان کو پہچاننے کی کوشش میں تھے لیکن وہ برابر نہایت بے تکلفی کے ساتھ ہم کو اپنا جملہ حقوق محفوظ قسم کا عزیز سمجھے جا رہے تھے اور اپنے ہر انداز سے یہ ثابت کر رہے تھے کہ ہمارا اور ان کا رشتہ تکلف اور دنیاوی مراسم سے بالاتر ہے چنانچہ

انہوں نے ہم کو اپنی طرف کھینچ کر نہایت پیار سے کہا۔

"خدا کی قسم تم ہو بڑے بے مروت یعنی کبھی تو بھول کر ہم غریبوں کو بھی یاد کر لیا کرو۔"

ہم اب تک یاد نہ کر سکے کہ یہ ہیں کون بزرگ اور ان سے ہمارا کیا رشتہ ہے۔ اگر ہم صاف صاف یہ کہے دیتے ہیں کہ ہم نے آپ کو نہیں پہچانا تو ممکن ہے بُرا مان جائیں اس لیے کہ ان کے برتاؤ سے تو کم از کم یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان جو رشتہ ہے وہ کم از کم بھولنے والا نہیں ہے لیکن سوال یہ تھا کہ جب ہم ان حضرت کو جانتے ہی نہ تھے تو اس کی ہم کو کیا خبر ہو سکتی تھی کہ ان سے رشتہ کیا ہے اور اس علم کے بغیر ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم ان کو کس رُخ سے مخاطب کریں۔ اور گفتگو کا کیا طریقہ رکھیں۔ لیکن بہت کچھ غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ چاہے جو کچھ بھی ہو ہم تو یہ ہرگز نہیں کہیں گے کہ ہم نے آپ کو نہیں پہچانا۔ البتہ ہم ان سے گفتگو میں یہ احتیاط ضرور رکھیں گے۔ کہ ہماری لاعلمی ثابت نہ ہو۔ ہم تو خیر اس ادھیڑبن میں پڑے ہوئے تھے لیکن وہ ہم کو پہچان چکے تھے لہٰذا انہوں نے نہایت آزادی کے ساتھ ہم سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔

بھائی! بات اصل میں یہ ہے کہ تم بھی اپنے کاموں میں مصروف ہو۔ اور ادھر ہم کو بھی دم لینے کی مہلت نہیں مگر بھائی! ایسا بھی کیا کبھی کبھی تو صورت

دکھا دیا کرو۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہزاروں کوس کے فاصلے پر ہیں۔"

ہم نے سنبھلتے ہوئے عرض کیا کہ بھائی صاحب بات یہ ہے کہ فرصت سے سب کچھ ہوتا ہے۔

کہنے لگے۔ "یہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ اپنے افکار جب چھوڑیں تو عزیز رشتہ دار بھی یاد آئیں۔ نہیں تو کیسے عزیز اور کیسے کچھ۔ گھر ہی کے جھگڑوں سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔

ہم نے پوچھا۔

"اچھا گھر میں سب خیریت تو ہے؟"

کہنے لگے۔

"ارے بھائی کیا خیریت پوچھتے ہو۔ اپنی سالی کے متعلق تو تم جانتے ہی ہو کہ ہمیشہ کی مریض ہیں بخدا جس دن سے شادی کر کے لایا ہوں آج تک تو ان کو تندرست دیکھا نہیں رہ گئے بچے ان کا کیا پوچھنا بیمار ماں کے بیمار بچے بھی قابل رحم ہوتے ہیں۔"

اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہ حضرت ہمارے ہم زلف ہیں۔ ہم نے اپنے تمام رشتہ داروں پر خیال دوڑایا لیکن ان میں بھی ان ہم زلف صاحب کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہم نے سوچا کہ بہ حقیقی ہم زلف نہیں۔ کسی رشتہ کی سالی کے شوہر ہوں گے

بہرحال ہیں ضرور ہم زلف۔ لہٰذا ہم نے جواب دیا۔

"ہاں صاحب ان کی صحت تو ہمیشہ سے خراب ہے۔ خداوند کریم ان کو صحت عطا فرمائے۔"

کہنے لگے۔

"ایک دن کی بیماری ہو تو کہا جائے ہم ان کو ہمیشہ سے بیمار اور اپنے کو تیماردار دیکھ رہے ہیں۔ اور اسی پر کیا منحصر ہے والدہ صاحبہ کے بھی بس آخری دن سمجھو۔"

ہم:۔ اجی خدا نہ کرے ان کا دم بھی غنیمت ہے۔ خداوند کریم ان کا سایہ ہم سب پر قائم رکھے۔

وہ:۔ نہیں بھائی اب تو ہم دعا مانگتے ہیں کہ ان کا خاتمہ بالخیر ہو جائے ان کی تکلیفیں اب دیکھی نہیں جاتیں۔

ہم:۔ اللہ رحم کرے۔

وہ:۔ سنا تھا کہ تمہارے گھر میں بھی کچھ طبیعت ناساز ہے۔ اب کیا حال ہے؟

ہم:۔ بفضلہ اب تو اچھی ہیں سب کو یاد کرتی ہیں۔

وہ:۔ خود ان کی بہن بھی ان کو دیکھنے کے لیے بےقرار ہیں۔ کسی دن تم ہی لے آؤ۔ اور ہاں وہ محمودہ کا کیا حال ہے؟

یہ نام ہمارے لیے بالکل نیا تھا۔ لیکن ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ کون

محمودہ؟ لہٰذا ہم نے جواب دیا: "اچھی ہیں وہ بھی۔"

وہ: اچھا میری طرف سے پیار کرنا اور کہہ دینا کہ تیرا خالو تجھ سے خفا ہے تو نے اس کو کبھی خط بھی نہ بھیجا۔ جیتی رہے اللہ کرے۔

ہم: ہنس کر چپ

وہ: ارے بھائی! اور بھی کچھ سنا کہ ممن بھائی کی بیگم صاحبہ کیا رنگ لائیں۔

ہم: (حیرت سے) کیا ہوا؟ ہم نے کچھ نہیں سنا۔

وہ: (چپکے سے) خاندان بھر کی گویا ناک جڑ سے اڑا دی۔ اس کے تو ڈھنگ اوّل دن ہی سے ایسے تھے کہ خود تم نے کہا تھا کہ خدا خاندان کی عزّت رکھے۔ چنانچہ وہی ہوا کہ پہلے تو گھر ہی میں خاندان کا نام ڈبویا لیکن آج چار دن سے بالکل لاپتہ ہیں کیا کہا جائے۔ اللہ مر جانے کو جی چاہتا ہے۔

ہم: مگر کچھ شبہ بھی ہے کہ آخر گئی کہاں؟

وہ: ارے بھائی! شبہ کیا بلکہ یقین ہے لیکن زبان سے نہیں نکلتا جہاں تک خیال ہے اسی درزی کے یہاں ہیں جس سے بہت دنوں سے پینگ بڑھے ہوئے تھے۔ اب بتاؤ کہ یہ بات زبان سے نکالنے والی ہے مگر خدا کے لیے اپنے ہی تک رکھنا۔

ہم: توبہ ہے۔ واقعی توبہ کرنے کا مقام ہے کیسا اس کم بخت نے خاندان کی عزت پر پانی پھیرا ہے

وہ: مگر ہمارے بھائی صاحب قبلہ کو دیکھیے کہ گویا کوئی بات ہی نہیں اور کوئی ہوتا تو سنکھیا کھا لیتا۔

ہم: اس چڑیل کی ناک کاٹ لینا چاہیے تھی۔

وہ: تم ناک کہتے ہو۔ میں کہتا ہوں گولی مار دینا تھی۔

ہم: کاش کہ یہ دن آنے سے پہلے طلاق ہی دے دی ہوتی۔

وہ: کیا کیا جائے بھائی! ہمارا تو یہ حال ہے کہ محلہ میں کسی سے آنکھیں چار کرنے کے قابل نہیں رہ گئے۔ ہر ایک یہی کہے گا کہ یہ اغوا شدہ بھاوج کے دیور میاں۔

ہم: واقعی تمہارے لیے بھی مر جانے کا مقام ہے۔

وہ: کیا کریں موت سے مجبور ہیں۔ ورنہ اس زندگی سے تو واقعی موت اچھی تھی۔

ہم نے گفتگو کا رُخ بدلنا چاہا اس لیے کہ اس غریب کی شرمندگی سے اب ہم کو بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ لہٰذا ہم نے کہا: "خیر بھائی چھوڑو اس قصے کو اب بتاؤ کہ آج کل آمدنی کا کیا حال ہے؟" کہنے لگے۔

"آمدنی کیا وہی گنی بوٹی نپا شوربہ پہلی تاریخ کو مقررہ تنخواہ بالائی آمدنی کا پتہ نہیں اور تم تو کہو دکان کیسی چل رہی ہے؟"

ہمارے باوا آدم سے لے کر اب تک کسی نے دکان نہیں کی تھی لہٰذا اس سوال کا کیا جواب دے سکتے تھے لیکن چونکہ ہمارے ہم زلف نے یہ سوال کیا تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ سوال غلط نہیں ہو سکتا تھا اس لیے ہم نے جواب دیا۔

"آج کل بڑے سناٹے ہیں۔"

وہ: آج کل ہر کاروبار کا یہی حال ہے۔ پھر کپڑے کی تجارت تو واقعی آج کل ٹھنڈی پڑی ہے۔

معلوم ہوا کہ ہماری دکان کپڑے کی ہے۔ لہٰذا ہم نے کہا۔

"تمام دن ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے ہیں اوّل تو گاہک آتے ہی نہیں اور آئے بھی تو کانگریس کے والنٹیر آنے نہیں دیتے۔ اب دن بھر کے تھکے ماندے گھر جا رہے ہیں۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو بلکہ اور گرہ سے خرچ ہو جاتا ہے۔

وہ: اچھا بھائی اب جاؤ گھر میں آرام کرو۔ تم سے مل کے بڑی خوشی ہوئی مگر کسی دن گھر پر ضرور آؤ۔ تمہاری سالی کہا کرتی ہیں کہ اقتدار بھائی نے تو آنا ہی چھوڑ دیا۔

اب ہم کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہم اقتدار بھائی ہیں۔ لہٰذا دل چاہا کہ کہہ دیں کہ ہم اقتدار بھائی نہیں ہیں لیکن پھر ہم نے سوچا کہ غریب بہت شرمندہ ہوگا اگر اس کو رات کے وقت مغالطہ ہوا ہے تو تم بھی ہم زلف بنے رہو۔ رشتہ ایسا ہے کہ کسی طرح گھاٹے میں نہیں ہو۔ لہٰذا ہم نے کہا۔ "اچھا بھائی سلام علیکم۔"

ہمارے راہ گیر ہم زلف صاحب نے بھی خدا حافظ کہا اور چل دیئے خیریت یہ ہوئی کہ ہمارے کسی شناسا نے ہمارا نام لے کر نہیں پکارا لیکن اس میں بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔ ہم کہہ دیتے کہ ہمارا یہ تخلص ہے۔

آرام کرسی

خداوند کریم بس اتنا روپیہ دے دے کہ انسان ایک آرام کرسی خرید لے تو پھر چاہے گھر میں چوہے ڈنڑ پیلیں یا پیٹ پر پتھر باندھا جائے لیکن آرام کرسی خواہ مخواہ بڑا بنا دیتی ہے اور آرام کرسی کو عجیب شرف بخشا ہے کہ خود تو وہ خیر سب کرسیوں سے ممتاز ہوتی ہے لیکن اس پر بیٹھنے والا بھی صدر منتخب نظر آنے لگتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرے کے گھر پر جا کر اس کو آخرکار اپنی اوقات پر اس طرح آنا پڑتا ہے کہ صاحب خانہ آرام کرسی پر دراز ہوتے ہیں اور وہ معمولی کرسی پر بیٹھنے کے لیے مجبور ہوتا ہے لیکن خود اپنے گھر پر تو اس کو یہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے کہ آرام کرسی پر نہایت شان سے خانہ ساز خلد اللہ ملکہ بنے بیٹھتے

ہیں۔ اور باقی تمام آئے گئے نہایت ادب سے حلقہ کیے ہوئے چاروں طرف بیٹھے ہیں۔ اس وقت آرام کرسی پر بیٹھنے والے کو اپنی قدر و قیمت خود معلوم ہوتی ہے۔ اور اپنے عالی مرتبہ ہونے کا خود احساس ہونے لگتا ہے جس کے بعد قدرتی طور پر ایک شان ایک دبدبہ ایک رعب ایک وقار اور ایک وجاہت پیدا ہو جاتی ہے خواہ ان باتوں سے ایک بات بھی غریب کو عمر بھر نصیب نہ ہوئی ہو لیکن یہ کیا کم ہے۔ کہ جب تک وہ آرام کرسی پر رہے گا یہ تمام چیزیں اس میں اس طرح موجود رہیں گی گویا خاندانی خصوصیات میں سے ہیں یہی وجہ ہے کہ تہذیب جدید نے اس بات کی اجازت دے دی ہے کہ ہر صاحب خانہ اپنے دولت خانہ یا غریب خانہ میں جہاں لوگوں کے بیٹھنے کے لیے چھ سات معمولی کرسیوں کا انتظام کرے وہاں اپنے لیے ایک آرام کرسی کا بھی انتظام ضرور کرے تاکہ جس وقت اس کے دوست احباب یا دوسرے ملنے والے اس کے گھر میں آئیں وہ بحیثیت میزبان کے ان کو تو معمولی کرسی پر بٹھا دے اور خود مہمانوں کے سامنے ٹانگیں پھیلا کر اس انداز سے آرام کرسی پر پڑ رہے کہ "ہمارا گھر ہے ہم آرام کرسی پر لیٹے ہیں۔ کسی کے باپ کا اجارہ ہے تم کو اگر غرض ہو تو معمولی کرسیوں پر بیٹھو ورنہ اپنے گھر کا راستہ لو" وہ اپنے مہمانوں کی ہر طرح خاطر تواضع کرے گا، پان دے گا، سگریٹ پانی پلائے گا۔ چائے شربت سے تواضع کرے گا۔ مگر آرام کرسی کے معاملہ میں وہ مروت کو دخل نہیں دے گا۔ اس کے مہمان معزز ہی لاٹ صاحب کیوں نہ ہوں مگر وہ اپنی آرام کرسی پر ٹانگیں پھیلائے

پڑا رہے گا اور اس کے مہمان حاشیہ نشینوں یا مریدوں یا حلقہ بگوشوں یا حکیم کے مطب کے مریضوں یا مکتب وغیرہ کے طالب علموں یا گول میز کانفرنس کے نمائندوں کی طرح نہایت ادب سے آرام کرسی کے چاروں طرف بیٹھے ہوں گے اور سب کو اسی طرح بیٹھنا پڑے گا۔ مشرقی تہذیب کو جانے دیجیے اگر اس کی پابندی کی جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دس پانچ آرام کرسیوں پر بیٹھیں اور میزبان خود ہی بن کر معمولی کرسی پر بیٹھے اور سب مہمانوں کے ساتھ اس طرح پیش آئے گویا ہر ایک کے یہاں فرداً فرداً پانچ روپیہ ماہوار اور کھانے پر ملازم ہے تو اب آپ ہی بتائیے کہ میزبان نہ ہوا خدمت گار ہو گیا۔ اسی دقت کو دور کرنے کے لیے تہذیب جدید نے میزبان کے لیے آرام کرسی ایجاد کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جب ہم اور آپ اور دوسرے مشرقی تہذیب کے عادی دقیانوسی قسم کے لوگ کسی ایسے مہذب آدمی کے یہاں جاتے ہیں جن کو خدا نے آرام کرسی دی ہے اور وہ ہم کو بدتمیزی تپاک سے مونڈھے نما کرسیوں پر بٹھا کر خود آرام کرسی پر دراز ہو جاتا ہے تو اس کی اس بدتمیزی آمیز حرکت پر بس خون ہی تو کھول جاتا ہے لیکن ذرا غور فرمائیے کہ جب آپ کے یہاں لوگ آتے ہیں اور آپ ان کو بٹھا کر خود دراز ہو جاتے ہیں تو کس قدر خون بڑھتا ہے اور آنے والوں کا کس قدر خون کھولتا ہوگا اس دنیا میں تو بس یہی کہ

؎ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

اگر آپ کی ناک ایسی ہی ہاتھ کی ہے تو کیوں جائیے کسی کے یہاں اپنے ہی گھر پر آرام کرسی لیے پڑے رہیئے جس کو غرض ہوگی خود آئے گا اور دربارداری کرے گا۔

آرام کرسی کا نام تو آرام کرسی ہے لیکن اس پر بیٹھ کر یا لیٹ کر آرام سے زیادہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور اس حساب سے اس کا نام کرسی تشخص ہونا چاہیئے اس لیے ہمارے نزدیک اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ اس پر بیٹھنے یا لیٹنے والوں کو امتیازی درجہ حاصل ہے آرام کرسی خود ہی کرسی صدارت یعنی اعزاز کی جگہ ہوتی ہے لیکن اس کو اور بہت سی چیزوں سے معزز تر بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً اسی کے قریب لگا ہوا حقہ یا سٹک اس کے پاس رکھا ہوا اگالدان اس کے ہتھے پر رکھا ہوا خاصدان۔ اس کے آگے رکھی ہوئی چھوٹی سی میز اور اسی پر پڑے ہوئے مخمل یا کمر وشیا یا زردوزی کے گدے وغیرہ۔ اگر ان چیزوں کا بھی انتظام ہو جائے تو کیا کہنا ہے۔ سونے میں سہاگہ والا معاملہ ہو جاتا ہے اور اسی طرح آرام کرسی کو ترقی دے کر تخت شاہی کے درجہ تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

لیکن سوال تو یہ ہے کہ ہمارے ایسے بدتمیز گھر میں آرام کرسی کس طرح رکھی جا سکتی ہے کہ جب کبھی باہر سے آکر دیکھئے یا تو کتے صاحب اس پر تشریف فرما نظر آتے ہیں، یا مرغی انڈا دیتی ہوئی اور اگر کچھ نہیں تو لونڈے اس کی ڈھال

پر سے پھسلنے کی مشق کرتے ہوئے ملتے ہیں چنانچہ اس کا نتیجہ ہے کہ ہماری آرام کرسی تھوڑے ہی دنوں کے مختلف طریقہ ہائے استعمال سے خدا جانے کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے بید نے اس کو اچھا خاصہ کھٹو بنا دیا ہے اور اب وہ سوائے رفع حاجت کے اور کسی کام کی نہیں رہی ہے۔

گھاگرا پار

لکھنؤ سے بہت دور گورکھپور میں مشاعرہ ہوا لیکن گورکھپور سے بہت دور لکھنؤ والوں کی شامت آئی یعنی سیکرٹری صاحب مشاعرہ کو خدا جانے کس نے بتا دیا کہ دفترِ سرپنچ لکھنؤ سے شاعر لائے جا سکتے ہیں چنانچہ وہ حضرت اپنی تمام سادگیوں اور معصومیوں کے ساتھ اس طرح تشریف لائے کہ ہم سے وعدہ لے کر ہی واپس گئے۔ حالانکہ جن تاریخوں کے لیے ہم نے وعدہ کیا تھا ان میں تو شاید مرنے کی فرصت نہیں نکال سکتے لیکن مشاعرہ اور مرنے میں نمایاں فرق ہے چنانچہ مرنے کے لیے فرصت نکلتی یا نہ نکلتی لیکن مشاعرے کے لیے فرصت نکلی اور اس طرح نکلی کہ ۲۴ دسمبر کی شب کو سرپنچ کے باپ

بیٹا روح القدس چارباغ کے چھوٹے اسٹیشن پر ٹہل رہے تھے اور گورکھپور جانے والی گاڑی ندارد تھی۔ اس ندارد سے نہ سمجھ لیجیے گا کہ چھوٹ چکی تھی بلکہ وہ ابھی تک آئی نہ تھی۔

گاڑی کا انتظار تو خیر اتنا تکلیف دہ نہ تھا لیکن چارباغ کے چھوٹے اسٹیشن پر بغیر سائبان کا پلیٹ فارم اور شبنم کا فیاضی کے ساتھ گرنا ضرور قابلِ غور تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہاں سوائے فرشِ خاکی کے اور کوئی بیٹھنے کی جگہ نہ تھی لیکن اس وقت ہم نے اس مصیبت کو محسوس کرنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا کہ پلیٹ فارم پر ٹہلیں اور گنگنائیں۔ اور بات ہے کہ گورکھپور کے مشاعرہ کی طرح تھی۔ ع

الله بچائے تری تاثیرِ نظر سے

اور ہم نے گنگنانا شروع کیا۔

زمیں سخت ہے آسماں دور ہے۔

لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد تمام پلیٹ فارم پر مغلئے اس کثرت کے ساتھ پیدا ہو گئے۔ ہمارا تمام ترنم تو تشریف لے گیا البتہ تھوڑی دیر کے لیے ہمارے ذہن میں یہ خیال جم گیا کہ ہم پشاور کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے اور اس کے بعد ہم نے غور کرنا شروع کیا کہ ایک چھوٹی لائن کی ٹرین میں یہ بڑی سل کے انسانوں کی فوج کس طرح سمائے گی اور اگر یہ سما بھی گئی تو ہم تینوں

کا کیا حشر ہوگا۔ ہمارا قلی ہم کو تسلیاں دے رہا تھا لیکن ہم طویل سفر، پہاڑ ایسی رات مغلیوں کی کثرت اور چھوٹی ٹرین کے بھیانک تخیلات میں کھوئے ہوئے تھے ہم کو یہ یقین تھا کہ مغلیے تیسرے درجہ کے علاوہ کسی درجے کے علاوہ کسی درجہ کے علاوہ کسی درجہ میں نہیں بیٹھتے اور ہمارا انٹر کلاس طوفان سے محفوظ رہے گا لیکن یہ بھی اندیشہ تھا کہ وہ ٹھہرے افغانی اگر انٹر کلاس گھس آئے۔ ہم کیا کر لیں گے۔ لیکن گاڑی کے آتے ہی ہم کو یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا کہ تمام مغلیے اپنی شلواریں پھٹکارتے اور تڑے پڑے نخ بلے وی وُئی کرتے ہوئے تیسرے درجہ کے مختلف ڈبوں میں اس طرح گھس گئے کہ ہمارا انٹر صاف بچ گیا اور ہم تینوں انٹر میں داخل ہو کر دو برتھوں پر قابض ہو گئے ہمارے ساتھ تین آدمیوں کے لیے دو بستر تھے اور تیسرا بستر اس لیے نہیں لیا گیا تھا کہ سبکدوش رہیں گے لیکن اب یہ سوال درپیش تھا کہ چھوٹی لائن کی پتلی پتلی برتھوں میں دو عدد لحافوں میں تین آدمی کس طرح بسر کریں گے لیکن یہ سوال چونکہ ریاضی سے تعلق رکھتا تھا اور ہمارا شمار ہمیشہ سے ماہرینِ ریاضی میں ہے اس لیے کہ ہم ہمیشہ حساب میں فیل ہوتے ہیں لہٰذا ہم نے اس سوال کو حل کر لیا اور یہ طے پایا کہ امین صاحب سلونوی تو ایک لحاف میں تنہا آرام فرمائیں۔ اس لیے کہ ان کو کھانسی آتی تھی اور ہم دونوں میں سے کوئی اس کے لیے تیار نہ تھا۔ کہ ان کے جراثیم کو سر آنکھوں پر جگہ دے اور ہم نسیم صاحب کے ساتھ ہم بستر

ہو گئے لیکن یہ ہم بستری اس لیے قابلِ اعتراض نہ تھی کہ ہم دونوں بالکل اس اس طرح لیٹے جس طرح بکس میں جوتے رکھے جاتے ہیں یعنی ایک کی ایڑی ایک کا پنجہ اور ایک کا پنجہ ایک کی ایڑی برتھ کے ایک سرے پر ہمارا سر تھا اور دوسرے سرے پر نسیم صاحب کا سر نمودار تھا دیکھنے والے یہی سمجھ سکتے تھے کہ خدا کی کیا قدرت ہے کہ دو منہے سانپوں کی طرح دو منہے انسان بھی پیدا کر دیے لیکن ہم دونوں نہایت آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ البتہ تمام رات اسی کشمکش میں بسر ہوئی کہ ہم اپنے پیر نسیم صاحب کے منہ پر رکھیں یا کہیں اور اسی طرح ان کو اپنے پیروں کی فکر تھی لیکن ہم دونوں میں نہایت ایمانداری کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ ایثار ہوتا رہا۔ ہم سوئے بھی اور جاگے بھی جاگے تو امین صاحب کی "کھوں کھوں" سے اور جب سوئے تو ان کی کھانسی کے رک جانے سے البتہ نسیم صاحب نے رات کا بیشتر حصہ اپنی مشاعرے والی غزل کی "اوورہالنگ" میں گنوا دیا۔ اس لیے کہ پانچ چھ برس کے بعد غزل کہنے کا اتفاق ہوا تھا یعنی ان کی شعریت پڑے پڑے زنگ آلود ہو چکی تھی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اب اس مشین کو پھر چلانے میں کس قدر دقت ہوئی ہوگی۔ ان کی غزل تو خیر لکھنؤ کی روانگی سے قبل ہی ہو چکی تھی لیکن اب ان کو سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اب اس کو پڑھیں گے کس طرح؟ اپنا ترنم بھول چکے تھے اور جب اس کو یاد کرنے کی کوشش کرتے تھے تو وہ خدا جانے کس کس رنگ میں یاد آتا

تھا مختصر یہ کہ وہ تمام رات فرنگی آرگن کے ساتوں پردے یکے بعد دیگرے آزماتے رہے اور صبح کے وقت جو لے نکلی تھی اس کی تعریف غالب مرحوم پہلے ہی کر گئے تھے۔ ؎

نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے

غزل کے ساتوں شعر ترنم کے ساتھ گراں قدر نمونے تھے۔ امین صاحب اب بھی کھانس رہے تھے اور ہم کو نیند آرہی تھی لیکن نسیم صاحب نے لحاف کھینچتے ہوئے کہا۔ "اب اٹھو گورکھپور قریب ہے۔" ہم نے لحاف میں منہ چھپاتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تھوڑا سا اور آگے بڑھا دیا جائے۔" امین صاحب نے کہا۔ "کھوں کھوں کھر" اور نسیم صاحب نے لحاف گھسیٹ لیا۔ مجبوراً ہم کو انگڑائی لینا پڑی اور انگڑائی لے کر پھر لیٹنا ہی چاہتے تھے کہ امین صاحب نے کھانستے ہوئے تکیہ بھی چھین لیا۔ مجبوراً ہم کو اٹھنا پڑا اور اٹھ کر سب سے پہلا کام یہی کیا کہ بستر باندھ کر کپڑے وغیرہ پہنے تاکہ گورکھپور کے پلیٹ فارم پر خیر مقدم کرنے والے ہم کو شریف سمجھیں۔ ہم کپڑے پہن کر بیٹھے ہی تھے کہ گورکھپور کے پلیٹ فارم پر گاڑی رکی اور ہم گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر آگئے۔ اسباب اتارا گیا اور چلنا ہی چاہتے تھے کہ ایک صاحب نے رازدارانہ طریقہ پر دریافت فرمایا کہ آپ حضرات مشاعرہ میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ ہم نے عرض کیا، جی ہاں آئے تو ضرور ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ ہمارے رہنما بن گئے۔

اور ایک موٹر پر ہم کو مع اسباب کے لاد کر ایک عالیشان مکان میں پہنچا دیا۔

یہ مکان صدر مشاعرہ جناب سید شاہ شاہد علی صاحب سبز پوش فانی رئیس اعظم کا دولت کدہ تھا جہاں صاحب خانہ اپنی تمام تقدس مآبیوں کے ساتھ ہم سے اس طرح ملے کہ ہم کو خواہ مخواہ عقیدت کش بن جانا پڑا۔ فانی صاحب یوں تو رئیس اعظم بھی ہیں اور سجادہ نشین بھی، سبز پوش بھی اور بزرگ بھی لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر ہیں اور شاعر بھی ایسے کہ گویا شاعروں کے لیے زندہ سند۔ اس کے علاوہ ان کے اخلاق نے ہم کو محو حیرت کر دیا حالانکہ میزبان کو بھی اخلاق برتنا چاہیئے تھا لیکن سچ یہ ہے کہ آج کل کے میزبان مہمانوں کے ساتھ اخلاق تو درکنار وہ سلوک کرتے ہیں جو کسی دفتر کا آفس سپرنٹنڈنٹ کلرکوں کے ساتھ کرتا ہوگا لیکن فانی صاحب کا تو یہ حال تھا کہ حالانکہ ہم تینوں ان کے بڑے منجھلے چھوٹے صاحبزادے معلوم ہوتے تھے لیکن وہ تھے کہ ہم لوگوں کے لیے بچھے جا رہے تھے ہم نے ان کو اور ان کی تمام تواضع کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ کر منہ ہاتھ دھویا کپڑے تبدیل کیے اور چائے شروع کر دی لیکن چونکہ دس ہی بجے سے مشاعرہ تھا اور اب بج چکے تھے تقریباً نو۔ لہٰذا مناسب یہی معلوم ہوا کہ لگے ہاتھ ماحضر بھی تناول فرما کر اپنے المکلف الملازمت کو بھی ممنون فرمائیں۔ چنانچہ یہ بھی ہوا اور ہم سب مشاعرہ جانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ عین اسی وقت محبی شمیم احمد صاحب فطرت واسطی بھی تشریف لے آئے جن کو اسٹیشن پر آنکھیں ڈھونڈ کر ناکام رہ چکی تھیں۔ یہ حضرت چاہے انسان

ہوں یا نہ ہوں لیکن خلوص کے پتلے ضرور ہیں۔ خیر صاحب ان سے بھی تھوڑی دیر تک خلوص بگھارا گیا اور پھر اس خلوص کو مشاعرہ تک باقی آئندہ کرنے کے بعد ہم تو صدر مشاعرہ یعنی اپنے میزبان کے ساتھ موٹر پر سینٹ اینڈریوز کالج کی طرف روانہ ہو گئے جہاں مشاعرہ تھا وہ بے چارے اپنے گھر چلے گئے ہوں گے۔

مشاعرہ گاہ یعنی کالج کے ہال میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ گورکھپور کا یہ عام قاعدہ ہے کہ جب مشاعرہ کا وقت دس بجے دیا جائے تو اس کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ مشاعرہ دو بجے شروع ہوگا۔ ہم نے اپنے دل میں کہا کہ سخت حماقت کی جو ابھی سے چلے آئے اور پھر بانیان مشاعرہ پر غصہ آیا کہ جب ان کو دو ہی بجے شروع کرنا تھا تو آخر صبح کا وقت کیوں نہیں دیا گیا تھا لیکن ہم کو زیادہ پیچ و تاب نہیں کھانا پڑا۔ اس لیے محمد انعام الحق صاحب عزیز سکریٹری مشاعرہ یعنی وہی حضرت جو ہمارا وارنٹ گرفتاری لے آئے اور ہمارا شکریہ وغیرہ ادا کرتے رہے کچھ دیر ہم سے اور صدر مشاعرہ سے گفتگو ہوئی کچھ دیر امین صاحب کی گفتگو اور ان کی کہانی سنتے رہے کچھ دیر نسیم صاحب کی غزل پڑھنے کا لطف اٹھاتے رہے یہاں تک کہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب مشاعرہ شروع کر دیا گیا اور کالج کے طلبا نے غزلیں پڑھنا شروع کر دیں۔ قصہ دراصل یہ ہوا تھا کہ مشاعرے کے دعوت نامے میں دو طرحوں کا اعلان اس طرح کیا گیا تھا۔

۱۔ "اللہ بچائے تری تاثیر نظر سے"

۲۔ "رہ فنا میں کوئی رہبر نہ ہو نہ سہی"

اور دونوں طرحوں کے بعد یہ نوٹ تھے کہ:

۱۔ دونوں طرحوں میں طبع آزمائی کوئی لازمی بات یا شرط نہیں ہے۔

۲۔ گیارہ اشعار سے زیادہ پڑھنے کی زحمت نہیں دی جائے گی۔

تو ہوا یہ کہ کالج کے طلبا نے اس کے یہ معنی نکالے کہ دونوں طرحوں میں طبع آزمائی کرنا کوئی لازمی بات یا شرط مشاعرہ تو نہیں ہے لیکن اگر کوئی دوگنی محنت کرے تو ظاہر ہے کہ بانیان مشاعرہ ممنون ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اس کے بعد یہ طے کیا کہ ہر غزل میں گیارہ اشعار سے زیادہ نہیں پڑھنا چاہیے لہٰذا دونوں غزلوں کے اشعار سے زیادہ نہیں پڑھنا چاہیے لہٰذا دونوں غزلوں کے اشعار ملا کر بائیس ہو گئے حالانکہ اگر کوئی بی اے ایل ایل بی قسم کا قانون داں شخص کہیں مشاعرہ کا سکریٹری یا صدر ہوتا تو یہ قانونی نکتہ نکال سکتا تھا کہ بفرض محال دونوں غزلوں کا پڑھنا جائز بھی قرار دے دیا جائے تو بھی یہ شرط کہ گیارہ اشعار سے زیادہ پڑھنے کی زحمت نہ دی جائے گی قائم رہتی ہے اور دونوں غزلوں کو ملا کر یا صرف ایک غزل میں ہر شخص گیارہ شعر تو پڑھ سکتا ہے لیکن بارہواں نہیں پڑھ سکتا لیکن وہاں یہ قانونی اعتراض نہیں کیا گیا اور اس کا خمیازہ تمام حاضرین مشاعرہ کو بھگتنا پڑا کہ کوئی شخص بغیر بائیس شعر پڑھے ہوئے اسٹیج سے اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ سنتے سنتے ناک میں دم آ گیا مگر کیا کرتے ہم شاعر تھے اور آداب مشاعرہ کا

لحاظ ضروری تھا ورنہ یہ نفس کشی ہمارے بس کا روگ نہ تھی خدا خدا کر کے دو بجے کے قریب طلبا ختم ہوئے اور مقامی شعرا نے پڑھنا شروع کیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ حضرات فی کس گیارہ شعر پڑھ کر بخش دیں گے مگر ہمارا خیال غلط ثابت ہوا۔ یہ حضرات اس دو طرحی مشاعرہ میں دو گونہ عذاب بن کر آئے تھے اور انہوں نے بھی وہی فی شاعر بائیس شعر کے نرخ مشاعرہ کو برقرار رکھا بس یہ سمجھئے کہ ہم کو تاؤ پر تاؤ آ رہا تھا مگر کیا کرتے مجبور تھے ہم کو تو اس وقت مولانا محمد علی کا یہ مصرعہ یاد آ رہا تھا۔

ع مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور

وہ تو کہیے عین اسی وقت برادرم منشی سکھدیو پرشاد بسملؔ، محترمی حضرت اصغر گونڈوی، حضرت ہادی مچھلی شہری اور ہمارے دیرینہ دوست جناب عنبرؔ گورکھپوری مشاعرہ میں آ پہنچے اور ہماری جان میں جان آئی۔ اس کے بعد سے مشاعرہ کم سے کم ہمارے لیے پرلطف ہو گیا۔ اس لیے کہ ہم ایک شعر سنتے تھے تو دس باتیں ان حضرت سے کر لیتے تھے، رہے ہم تو ہم امین صاحب سلونوی کو بھی اب ذرا دور کی سوجھی اور لگے اپنے مخصوص انداز میں شعرا کو داد دینے لگے لیکن نسیم غریب اپنی غزل کی دھن میں تھے اور بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی طالب علم امتحان کے کمرہ میں جانے کے لیے تیار ہو رہا ہے کبھی ہم سے کہتے تھے کہ "ارے یار ہم سے نہ پڑھواؤ"۔ جب ہم کہتے تھے کہ "احمق ہوئے ہو" تو وہ پھر تیاری میں مصروف ہو جاتے تھے۔ بہرحال اب مشاعرہ اچھی طرح کٹ رہا تھا شمیم صاحب حیرت اور ان کے

والد محترم حکیم عارف صاحب مدیر شاہکار ہم پر سے مشاعرہ کا بار ہلکا کرنے کے لیے آ گئے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ استاد الشعراء منقار الدولہ جن الہند حضرت ناچیز گورکھپوری بھی تشریف لے آئے تھے کبھی ان سے کچھ بات کر لی کبھی عنبر کو چھیڑ دیا یہاں تک کہ مغرب سے ذرا قبل بیرونی شعرا کی نوبت آئی اور ہم نے نسیم صاحب کی طرف دیکھا اس وقت وہ غریب نہایت تیزی کے ساتھ غزل کی لے رٹ رہا تھا اور چہرہ پر تو ایسی ہوائیاں اڑ رہی تھیں گویا اب ان کو پھانسی کا حکم سنایا جائے گا ہم کو اپنی طرف مخاطب دیکھ کر اس نے نہایت بے کسی کے انداز میں کہا "ہماری غزل کسی اور سے پڑھوا دو"۔ اس وقت ہم نے بھی یہی مناسب سمجھا اور برادرم فطرت سے کہا کہ بھائی تم شمیم ہو لہٰذا نسیم کی غزل پڑھ دو۔ وہ تیار ہو گئے اور نسیم صاحب کا یہ حال ہوا گویا نئے سرے سے زندگی پائی ہے۔ ان کی غزل پڑھی گئی اور خوب خوب سنی گئی ان کے بعد امین صاحب سلونوی نے غزل فرمائی اور مشاعرہ کا رنگ بدل دیا آپ کے بعد یہ خاکسار اسٹیج پر غزل پڑھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ معلوم نہیں ہماری غزل کا کیا حال رہا۔ اس لیے کہ غالباً غزل پڑھنے والے کو اپنی غزل کے رنگ جمنے یا نہ جمنے کی خبر نہیں ہوتی۔ بہرحال ہم نے اپنی غزل پڑھی اور سلام کرتے ہوئے پلیٹ فارم سے اتر آئے۔ یہی خیریت ہوئی کہ بنائے نہیں گئے۔

ہمارے بعد جناب بسمل نے مشاعرہ کو بسمل کیا پھر حضرت ہادی مچھلی شہری نے مشاعرہ کو ماہی بے آب بنایا اور اس کے بعد نشاط روح کے روحِ رواں

بلکہ ہندوستان اکاڈمی کے تماہی رسالہ ہندوستانی کے ایڈیٹر جناب اصغر گونڈوی کی باری آئی۔ اصغر صاحب میں یہ خاص بات ہے کہ ان کو شعر کہنا تو ایسا آتے ہیں کہ سبحان اللہ لیکن پڑھنا بالکل نہیں آتا وہ مخصوص احباب کے مجمع میں تو خیر کسی نہ کسی طرح ترنم کے ساتھ شعر پڑھ دیتے ہیں لیکن مشاعرہ میں تو بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ نسیم صاحب ہی کے کوئی ضخیم ایڈیشن ہیں۔ ہم ان کی گھبراہٹ بلکہ پس و پیش کو پہلے ہی محسوس کر رہے تھے لیکن جب وہ مردانہ وار پلیٹ فارم پر پہنچ گئے تو ہم نے کہا واہ رے شیر لیکن جب انہوں نے پڑھنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ وہ اگر کوشش بھی کریں تو شعر سنانا ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ مجمع نے "بلند آواز سے" "بلند آواز سے" کے نعرے لگائے اور اصغر صاحب نے پہلو بدلنا شروع کر دیئے۔ ان کی یہ حالت ہم سے نہ دیکھی گئی اور پلیٹ فارم پر پہنچ کر ان کی غزل ان کی طرف سے پڑھنا شروع کر دی۔ اب مجمع مطمئن تھا اور اصغر صاحب بھی مطمئن۔ اس وقت ان کے دل سے ہمارے لیے جو دعائیں نکلی ہوں گی۔ ان کو کچھ ہم ہی جانتے ہیں یا اصغر صاحب جانتے ہوں گے۔ اصغر صاحب کی غزل پڑھنے کے بعد ہم کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے حلق میں ببول کا کوئی پودا نشو و نما پا رہا ہے بہرحال ہم خود اپنے ہاتھ سے اپنا گلا تھامے ہوئے دوسری مرتبہ پلیٹ فارم سے اترے اور صدر مشاعرہ کی وجد آفریں غزل سننے لگے۔ فانی کے کلام کی داد دینا ہم اپنے نزدیک ذرا گستاخی سمجھتے ہیں۔ اس لئے

کہ چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے گی۔ اس غزل کے بعد مشاعرہ ختم ہو گیا لیکن حضرت ناچیز اپنی کا ثبوت دیتے رہے اور ہم سب ان کو پڑھتا ہوا چھوڑ کر باہر آ گئے

مشاعرہ سے باہر آ کر ہم بھی مجنوں گورکھپوری کے والد بزرگوار یعنی جناب دیوانہ گورکھپوری جن کو ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے مگر سمجھے خاک نہ تھے اور نہ اس کی کوشش کی تھی موجود تھے اور ہم سب کو گورکھپور کے سودیشی شعرا کے علاوہ بدیشی شعرا جتنے تھے سب کو کہیں لے جانا چاہتے تھے ہم تو گویا مردہ بدست زندہ تھے آپ۔ موٹر میں لاشوں کی طرح لاد کر ایک نہایت عالی شان کوٹھی میں پہنچا دیئے گئے جس کا نام دیکھ کر ہم سمجھے کہ مولانا ابو الکلام آزاد کے دفتر یہی ہے۔ اس لیے کہ جلی حروف میں "الہلال" لکھا ہوا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دراصل گورکھپور کے شرافت مجسم، نجابت مجسم، سخاوت مجسم، صباحت مجسم، ملاحت مجسم فصاحت مجسم اور بلاغت مجسم رئیس اعظم شاہ جواد علی میاں کی کوٹھی ہے۔ اس کوٹھی کے سبزہ زار پر ہم سب چرنے کے لیے چھوڑ دیئے گئے۔ یہ گویا ایٹ ہوم سے ذرا چھوٹی ٹی پارٹی سے ذرا بڑی قسم کی دعوت تھی اور یہاں ایسے لوگ بھی موجود تھے۔ جو اس ذرہ بے مقدار کے مزاحیہ مضامین کے دوسرے مجموعہ "بحر تبسم" میں چائے والا مضمون پڑھ چکے تھے اور میرے عشق لپٹن سے واقف تھے لہٰذا مجھ کو بھر بھر کے چائے کی پیالیاں ملنے لگیں نسیم صاحب میٹھے قسم کے بسکٹوں اور پیسٹریوں پر ٹوٹ پڑے۔ امین صاحب نے وہ چیزیں انتخاب کر لیں جو کھانسی کے لیے یا تو مفید

تھیں یا کم سے کم مضر نہ تھیں اور باقی حضرات مختلف چیزوں پر ہاتھ مارہے تھے چاء کا دور ختم ہونے کے بعد پھر شاعری شروع ہو گئی تا کہ شاہ جواد علی میاں جو اپنی خاندانی روایات کے مطابق مشاعرہ کی شرکت نہ کر سکتے تھے ہم لوگوں سے بحیثیت شاعر کے بھی مل لیں۔

یہ سلسلہ رات کے نو بجے تک جاری رہا اور ہم میں سے اگر سب نہیں تو کم سے کم میں ضرور ان کی خوش مذاقی اور پاکیزگی ذوق سے مسرور ہوتا رہا لیکن ڈر معلوم ہو رہا تھا۔ دیوانہ صاحب سے اس لیے کہ اول تو وہ مجنوں صاحب کے والد محترم تھے دوسرے ان کی برجستہ تنقیدیں برمحل چٹکیاں اور فنی معلومات کا بے دھڑک استعمال ہماری تمام قابلیت کے نشہ کو ہرن کر چکا تھا اور ہم یہی دعا مانگ رہے تھے کہ خدا عزت رکھ لے لیکن وہ تھوڑی ہی دیر میں جہاں تبحر کی بہترین مثال ثابت ہوئے وہاں دلچسپی اور دلبستگی کا بھی بہترین نمونہ ہو گئے اور ہم نے محسوس کیا کہ ان میں ایک نامعلوم کشش ہے جو ہم کو ان کی طرف کھینچ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی تک تو وہ اس مجمع کے لیے ایک بارگراں تھے لیکن اب شمع محفل نظر آنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قسم کے "المختصر" انسان میں اتنی بہت سی باتیں کس طرح سما گئی ہیں لیکن آج ہم کو اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ واقعی بہت سے انسان جتنے زمین کے اوپر نظر آتے ہیں۔ اس کے دو چند بلکہ سہ چند زمین کے نیچے بھی ہوتے ہیں۔

اس مجموعۂ طلسم جواد علی شاہ میاں تو اپنا خاموش جادو ہم سب پر چلا رہے

تھے اور ہم سب اس مجمع کے سامنے جھکے ہوئے کندھا ڈالے بیٹھے تھے بڑی مشکل سے نو بجے کے قریب جلسہ ختم ہوا اور ہم سب اپنی اپنی قیام گاہ کو رخصت ہوئے لیکن اس سے قبل کہ ہم روانہ ہوتے نسیم صاحب کے گورکھپور میں بھی سرپنچ کے خیال نے چٹکی لی اور انہوں نے شاہ جواد علی میاں سے سرپنچ کے لیے گشت کرنے کو صبح موٹر مانگ لی۔ اس لیے کہ دوسرے دن سرپنچ کی اشاعت کے لیے ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ قصہ مختصر یہ کہ الہلال سے روانہ ہو کر ہم کو از روئے قاعدہ اپنے میزبان خصوصی جناب فانی سبز پوش کے دولت کدہ پر آنا چاہیے تھا لیکن ہم راستہ بھول کر خدا جانے کہاں پہنچے لیکن یہ قیاس ہے کہ چونکہ مجنوں صاحب ہمارے رہنما تھے لہٰذا وہ ہم کو نجد ہی میں لے گئے ہوں گے۔ بہرحال یہ عرض کر دینا کافی ہوگا کہ نجد بھی لیلیٰ سے خالی نہ تھا۔

اپنے قیام پر آئے اپنے میزبان کو کھانے کی میز پر منتظر پایا۔ پھر کھایا کچھ پیا اور جا کر خواب گاہ میں اس طرح سوئے کہ امین صاحب کی ہمبستر تو حسب معمول ان کی کھانسی تھی اور ہم زنانہ رسالہ حریم کے پروپرائٹر نسیم صاحب کے ساتھ ہم بستر تھے لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی اور گھوڑے بیچ کر ایسے سوئے کہ صبح سات بجے کے قریب آنکھ کھلی یعنی اس وقت جب کہ ہم کو ایک صاحب کے یہاں چاء پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ موٹر ہمارے انتظار میں تھا لہٰذا ہم نے جلدی جلدی داڑھی صاف کی ہاتھ منہ دھو کر چل دیے اور پہنچے مجنوں صاحب

کی سسرال، جہاں سے ان کو ساتھ لینا تھا اور ان کو ساتھ لے کر حسن صاحب کے یہاں چاء پر مدعو تھے۔ ان کے یہاں پہنچے۔ اگر وہ صاحب ہم کو معاف فرما دیں۔ تو ہم ان کا اسم مبارک بھول گئے۔ لیکن خیال یہ ہے کہ یا تو عنایت صاحب ان کا نام نہ تھا۔ ورنہ نعمت صاحب ضرور تھا۔ اور یہ بھول چوک محض اس لیے ہے کہ انہوں نے سرپنچ کی خریداری منظور کرنے کے بعد بھی نقد رقم نہ دی ورنہ ان کا نام درج رجسٹر ہو جاتا۔

ہمارا یہ گشت کامیاب بھی رہا اور دلچسپ بھی۔ کامیاب اس لیے کہ خریدار کم وقت میں بہت سے مل گئے اور دلچسپ اس لیے کہ بھانت بھانت کے انسانوں سے سابقہ پڑا۔ مجنوں صاحب نے ایک صاحب کی بڑی تعریف فرمائی اور ان کا پتہ بتا کر کہہ دیا کہ وہ ضرور خریدار ہوں گے لہٰذا ہم نے موٹر کا رخ اسی طرف کر دیا۔ اور مجنوں سے رخصت ہو کر ایک آدھ صاحب کو خریدار بناتے ہوئے ان کے یہاں پہنچے۔ اس وقت ہمارے ساتھ سیکرٹری صاحب مشاعرہ بھی تھے۔ ہم تینوں بلکہ سیکرٹری صاحب کو ملا کر چاروں صاحبان نے بہت جھک جھک کر سلام کیا لیکن بجائے جواب دینے کے انہوں نے ہونق صورت بنائی پھر فرمایا۔ "کیا ہے؟"

ہم نے عرض کیا۔ "آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔"

کہنے لگے۔ "ایں ایں؟"

ہم نے ذرا بلند آواز سے کہا۔ "آپ ہی کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔"

انہوں نے مار بیٹھنے کے انداز میں کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر نہایت ڈراؤنی انداز میں کہا۔ "ایں۔ ایں۔ آئیں۔ آئیں۔"

ہم نے اور بھی زور سے کہا۔

"آپ کے ہی پاس آئے ہیں۔"

اس کے بعد انہوں نے اتنی زور سے 'ایں' کہا جس کو اگر لکھا جا سکتا ہے تو اسی قلم سے لکھا جا سکتا ہے جس سے "سرپنچ" کا سرنامہ لکھا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی اس وحشت سے ہم کو یقین ہو گیا کہ یہ بہرے بھی ہیں اور پاگل بھی۔ ماریں گے بھی اور کاٹ بھی کھائیں گے۔ لہٰذا ہم تو چپ ہو گئے لیکن سیکرٹری صاحب مشاعرہ نے کہا۔

"یہ حضرات لکھنؤ سے مشاعرہ میں آئے تھے۔"

انہوں نے پھر بڑی زور سے دھاڑ مار کر کہا۔

"تو پھر اب کیا ہے مشاعرہ تو ختم ہو گیا۔"

ہم نے دل میں کہا۔ بھاگو یہاں سے لیکن امین بھلا کب چوکنے والے تھے۔ انہوں نے ان حضرت کو راہ پر لانے کی کوششیں شروع کر دیں اور بڑی دیر تک سر کھپانے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ہم سب نے یہاں آ کر خون بھی خشک کرایا اور وقت بھی ضائع ہوا لیکن یہی کیا کم ہے کہ پٹے نہیں اور صحیح

سلامت واپس آ گئے۔

وہاں سے واپسی پر پھر ہم کو شاہ جواد علی میاں کے یہاں ڈنر پر پہنچنا تھا چنانچہ پھر الہلال پہنچ گئے جہاں علاوہ شعراء کے مخصوص معززین بھی تشریف رکھتے تھے۔ ڈنر سے قبل تو خوش گپیاں ہوتی رہیں لیکن اس کے بعد ہی کھانے کی میز پر غذائے روح بھی چن دی گئی۔ حالانکہ پر تکلف ڈنر کے بعد کسی کے پیٹ میں اس غذائے روح کی بھی جگہ نہ تھی لیکن شعر بازی ہوتی رہی۔ اب ہم کو پھر سر بنج کے لیے گشت کرنا تھا۔ لیکن دیوانہ صاحب نے ہم کو جانے نہ دیا اور طے یہ پایا کہ ہم آج سہ پہر کو شاہ جواد علی میاں کے فارم کی سیر کریں یہ پر خلوص دعوت کیسے روکی جاتی لیکن سوال یہ تھا کہ ہم کو آج ہی واپس ہونا بھی تھا اور اپنے میزبان فانی صاحب سے رخصت ہونا تھا۔ اس لیے کہ وہ بہار شریف تشریف لے جا رہے تھے۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ ہم ان سے ابھی سے رخصت ہو لیں اور اپنا سامان حکیم عارف صاحب کے یہاں پہنچا دیں۔ جہاں سے دعوت میں شرکت کے بعد ہم کو گورکھپور سے رخصت ہونا تھا۔ لہٰذا اسی پروگرام پر عمل کرنے کے بعد ہم شاہ جواد علی میاں کے فارم پر پہنچے۔ اور اسی مقام پر سہ پہر کی چائے بھی پی وہاں سے واپسی پر دیوانہ صاحب سے گفتگو کا کافی موقع ملا اور اس وقت ہم کو محسوس ہوا تھا کہ کوئی روحانی طاقت ہم میں خود بخود سما رہی ہے۔ اس گفتگو کے متعلق ہم دیوانہ صاحب

کو مخاطب کر کے صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ یہاں غالبؔ کے بجائے دیوانہ سمجھئے
تجھے ہم ولی سمجھتے جو اس قدر کھویا ہوا سا اور منتشر سا انسان نہ ہوتا۔

لیکن ہم کو پھر بھی بہت سی ایسی چیزیں اس گفتگو سے حاصل ہوئیں جو اب تک حاصل نہ ہوئی تھیں۔

واپسی پر ہم الہلال آئے۔ شاہ جواد علی میاں صاحب سے رخصت ہوئے اور دفتر شاہکار پہنچے تاکہ اپنے پر خلوص دوست فطرت واسطی اور بزرگ محترم حکیم عارف صاحب کے یہاں پر خلوص دعوت کھائیں۔ اس لیے نہ کہیں گے کہ یہ دعوت نہیں بلکہ دراصل خلوص ہی تھا مچھلی کھائی۔ پلاؤ کھایا۔ فرنی کھائی۔ کباب کھائے اور پڈنگ کے تیار نہ ہونے کا افسوس دل میں لیے ہوئے اسٹیشن پر پہنچے۔ یہاں سیکریٹری صاحب مشاعرہ مع اپنے کالج کے ایک پروفیسر صاحب اور ایک طالب علم صاحب کے موجود تھے۔ ان حضرات نے ہم کو کانٹوں میں گھسیٹنا شروع کر دیا یعنی ہمارا سامان موٹر سے خود اتارا اور ریل میں خود رکھا خصوصاً سیکریٹری صاحب مشاعرہ نے تو یہ ثابت کر دیا کہ گویا ایک سیکریٹری مشاعرہ کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ باہر سے آنے والے شعراء کا بستر بھی خود لگائے۔ ہم ان کی نوازشوں سے عرق عرق ہو رہے تھے کہ دیکھتے کیا ہیں کہ دیوانہ یہاں بھی موجود اور پھر کیا دیکھتے ہیں کہ

بزرگ محترم فانیؔ صاحب بھی موجود۔ یا اللہ یہ کیا قصہ ہے کیا یہ حضرات گورکھپور سے سارے خلوص کے ہم کو لکھنؤ تک پہنچا کر چھوڑیں گے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں گاڑی نے سیٹی دی اور ہم سب نہایت گرمجوشی کے ساتھ آپس میں ملے۔ دیوانہ صاحب سے ملنے کے وقت میرے قلب کی حرکت بڑھ گئی تھی اور سیکرٹری صاحب مشاعرہ سے ملنے کے وقت میری آنکھوں میں محبت اور مسرت کے آنسو تھے۔ اور مجھ کو محسوس ہو رہا تھا کہ حضرات گورکھپور نے مجھ کو اپنے خلوص سے اپنا لیا ہے۔ میں اس خلوص کو شاید کبھی نہ بھولوں۔ یہ مزاح نگاری بھی نہیں کر رہا ہوں بلکہ واقعہ نگاری ہے۔ گاڑی چلی اور ہم گورکھپور والوں کی شوکت نوازی، امین نوازی، نسیم نوازی اور سب سے بڑھ کر سرپنج نوازی کے خیالات میں مستغرق ہو کر اس وقت ہوشیار ہوئے جب لکھنؤ کے اسٹیشن پر نسیم صاحب قلی پکار رہے تھے اور امین صاحب کھانس رہے تھے۔

بیوی کا پرپیگنڈہ

ارے بھئی وہ تمہاری بھاوج آج صبح سے تم سب کا انتظار کر رہی ہیں۔
انہوں نے آم وغیرہ خرید کر رکھے ہیں۔

ان کے اس الفاظ سے ہم میں سے ہر ایک نقش حیرت بن کر رہ گیا۔ بات یہ تھی کہ وہ خود تو حلقہ احباب میں اپنے نام کے برعکس ابلیس کے نام سے مشہور تھا اور ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے شیطانی لشکر کو اگر کہیں شکست فاش ہوئی ہے تو وہ ان ہی حضرت کی کنجوسی کے مقابلہ میں ان کو بے وقوف بنا کر کھانا تو خیر ہمارے فرشتوں کے بس میں بھی نہ تھا لیکن انہوں نے کبھی ہم کو مسکین سمجھ کر بھی یہ ثواب حاصل کرنے کی کوشش نہ کی اور ہمیشہ یہی اصول رکھا کہ

گر جاں طلبی مضائقہ نیست
گر زر طلبی سخن درنیست

یہاں تک کہ ہم سب تھک کر مایوس ہو چکے تھے کہ ان تلوں سے تیل نہیں نکل سکتا اور یہ شخص "چمڑی جائے دمڑی نہ جائے" کی زندہ تصویر ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آج خلافِ معمول ان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر ہم سب کو حیرت تھی بلکہ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ الفاظ واقعی ابلیس نے کہے ہیں اور ان میں کوئی اصلیت بھی ہے۔ یہاں تک کہ میں نے خود اس طلسم حیرت کو توڑ کر گہری حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"کیا کہا تم نے آموں وغیرہ کا انتظام کیا ہے؟"

لاپرواہی سے جواب دیا۔ "ارے بھائی ہاں صبح سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ بار بار پوچھ چکی ہیں کہ تمہارے دوست آتے کیوں نہیں ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ شاید آج آئیں تو بے چاری آموں میں برف ڈالے بیٹھی رہیں مگر بھلا تم لوگ ہمارے یہاں کیوں آنے لگے۔"

ہم نے کہا "یہ بات ہے تو ہم ابھی چلتے ہیں مگر کیا واقعی تمہاری بیوی نے ہم لوگوں کے لیے آج آموں کا انتظام کیا ہے؟" اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ "اب میں آخر کس طرح کہوں مگر اب کیا کرو گے جا کر انتظار کرتے کرتے انہوں نے آم تقسیم بھی کر دیئے مگر خیر چلو شاید بچے ہوں۔"

ہم سب نے کہا۔ "خدا کرے کہ ابھی باقی ہوں" اور فوراً ان کے ہمراہ یتیم خانہ کے بچوں کی طرح ہو لیے۔ ان کے گھر پہنچ کر زیادہ انتظار بھی نہ کرنا پڑا۔

وہ فوراً ہی ایک طشت میں کچھ تخمی آم لیے ہوئے برآمد ہوئے اور ایک عجیب ٹھاٹھ سے فرمایا۔ "لو کھا لو۔" لاش پر بیٹھنے والے گدھوں کی طرح ہم آموں پر ٹوٹ پڑے۔ حالانکہ آم بہت تھوڑے تھے اور کچھ مزے میں بھی زیادہ اچھے نہ تھے لیکن ہم سب تو یہ سمجھ کر آم کھا رہے تھے کہ "مرے موذی کو مارا" اور تعریف کرتے جاتے تھے یا نہ کرتے ہمارے میزبان صاحب خود ہی تعریفوں کے پل باندھے ہوئے تھے۔ "دیکھو یہ آم چھوٹے ضرور ہیں اور ان کا ریشہ بھی بہت بڑا ہے لیکن عجب پُر کیف آم ہیں تم ان کی کھٹاس پر نہ جاؤ اور نہ رس کی کمی پر غور کرو بلکہ یہ دیکھو کہ لطیف آم ہیں، مگر یار بڑے گراں ہیں۔ وہ تو کہو کہ یہ آم والا ہمارے یہاں بہت رعایت سے آم دے جاتا ہے۔ اور تمہاری بھاوج روز اسی قسم کے آم کھاتی ہیں۔ اس لیے اس نے بہ تمام مشکل چھ آنہ سیکڑہ یہ آم دیئے ہیں ورنہ منڈی میں ایک روپے سے نہیں مل سکتے۔ بھائی اسی لئے میں نے دسہری اور سفیدہ وغیرہ سب کو چھوڑ کر ان ہی کو پسند کیا ہے۔ واللہ سب آموں کا ان میں مزا ہے گویا شہد کے سربمہر گلاس ہیں اور اتنے سے آم میں گٹھلی تو دیکھو ماشاء اللہ کتنی بڑی ہے۔"

مجھ سے نہ رہا گیا اور آخر میں نے مجبوراً کہا۔ "او منحوس! او انسانیت کے دشمن! یہ آم انسانوں کے کھانے کے ہیں۔ نہ کم بختوں میں رس ہے نہ کوئی مزا معلوم ہوتا ہے کہ تیزاب کا ابل بیٹھے چوس رہے ہیں اور ریشے تو ایسے ہیں کہ گویا تو ہم کو آم نہیں کھلا رہا ہے کمہاروں کی طرح رسی بٹوا رہا ہے ارے کم بخت آج

تم نے خدا خدا کر کے کفر توڑا تھا تو ذرا ڈھنگ کے آم لایا ہوتا لاحول ولا قوۃ۔

ناک بھوں چڑھا کر بولے۔ ”خیر چھوڑو اس قصہ کو تم کو تو بس ہر چیز میں عیب نکالنا آتے ہیں مجھ سے کیا کہہ رہے ہو۔ ان بیگم صاحبہ سے کہو جنہوں نے تم ایسوں کو بلا کر آم کھلائے ہیں۔“

ہم سب نے مصلحت یہی دیکھی کہ اس وقت چپ ہو رہیں بلکہ سب نے بہت بہت تعریف کی اور ان کی بیوی کی تو اتنی تعریف کی کہ ہمارے پاس الفاظ نہ رہے۔ اور ان کو مزید تعریفیں کرنے کا موقع مل گیا۔

کہنے لگا۔

”کچھ عجیب ان کی عادت ہے کوئی اچھی چیز ہو بس اس کا سب سے پہلے دل یہی چاہے گا کہ تم لوگ آجاؤ اور تم کو کسی طرح یہ چیز مل جائے۔ آج صبح کچھ کیک خود ہی بنالئے تھے اور لطف یہ کہ آپ کھاتی جاتی تھیں اور انگریزی بولتی جاتی تھیں لیکن میری شامت آئی میں نے کہہ دیا۔ ع

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانئ گفتار

بس جناب انہوں نے برجستہ کیتلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ع

رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

میں تو جناب دنگ رہ گیا کہ غالب کا کلام ان کو کس طرح یاد ہے اور آج ہی پر کیا منحصر ہے۔ ابھی تین چار دن ہوئے نہیں معلوم کس بات پر میں نے کہا۔

ع خیال کیجئے کیا آج کام میں نے کیا

بس فوراً ہی آپ بال بناتے بناتے بولیں۔ ع

جب اس نے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا

اور جب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ آپ نے ”شٹ اپ“ کہہ کر میرا منہ اپنے ہاتھ سے بند کر دیا۔ اور کہنے لگیں کہ غالب نے بھی یہی کہا ہے اور انشاء اللہ ان سے اچھا کہا ہے۔ ؎

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

اس کے علاوہ فارسی شعرا کا کلام تو ان کو یاد ہے کہ میری نظر سے بھی نہیں گزرا۔ کچھ دن ہوئے میں نے اپنے ایک مضمون میں غالب کا یہ شعر لکھا کہ ؎

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

جب میں نے ان کو مضمون سنایا تو کہنے لگیں کہ اس کی جگہ فیضی کا یہ شعر لکھ دو۔ ؎

دریاب کہ ماندست ز دل قطرۂ خونے
آں قطرہ ہم از دست تو لبریز چکیدن

ہم سب خاموش بیٹھے ہوئے اس کی باتیں سن رہے تھے اور وہ اپنی بیوی

کا قصیدہ پڑھ رہا تھا لیکن میں نے کہہ دیا کہ "ان کو شاعرہ ہونا چاہیئے اور وہ بہت خوب کہہ سکتی ہیں۔"

بس پھر انہوں نے سلسلہ شروع کیا۔

ہاں ہاں موزونیت تو اس بلا کی پائی جاتی ہے کہ میں تم سے کیا کہوں کوئی مصرعہ ان کے سامنے پڑھ دیجئے۔ پھر دیکھئے کیا کیا فرماتی ہیں اور جس وقت ان پر شعریت طاری ہوتی ہے۔ اس وقت تو وہ جو کچھ کہتی ہیں۔ ایک شعر ہوتا ہے۔ کل رات کو آپ لیٹی ہوئی چاند کو دیکھ رہی تھیں اور اس قدر محو تھیں کہ کس طرح اپنی نظریں نہ ہٹاتی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا دیکھ رہی ہو۔ "کہنے لگیں چاند کی معصوم اور خنک دنیا کو۔" اور پھر فرمایا۔ ؏

چاند کی ٹھنڈی شعاعیں لرزہ بر اندام میں

اور پھر جب میں نے داد دی تو آپ نے شوخی سے کہا۔ "اجی میں کس قابل ہوں، سب آپ ہی کا فیض ہے۔

تو یہ تم سچ کہتے ہو کہ ان کو شاعرہ ہونا چاہیئے۔ واللہ اگر ان پر ذرا توجہ کی جائے تو وہ بہت ہی لاجواب کہنے لگیں۔

چلتے چلاتے ہم نے پھر کہہ دیا کہ "ان سے مضمون لکھوایا کرو۔"

بس اس نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا اور کہنے لگا۔

"وہ تو برابر لکھتی ہیں۔ کیا تم نے ان کا کوئی مضمون نہیں دیکھا۔ عرصہ سے

لکھ رہی ہیں اور کبھی میں نے اصلاح تک نہیں کی ہے ان کو تو ادبی ذوق کچھ اس طرح ہے کہ گویا گھٹی میں ملا ہو اور بھائی اسی لیے تو میرا گھر جنت ہے۔ میں تو تمام دنیا کی راحتیں اپنے گھر کی چھوٹی سی جنت پر قربان کرتا ہوں۔"

ہم سب بمشکل تمام اجازت لے کر واپس آئے اور غور کرنے لگے کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے کیا واقعی اس کی بیوی ایسی ہی ہے جیسی وہ کہتا ہے۔ اور اگر اس کا بیان صحیح ہے تو اس عورت کے ہوتے ہوئے ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو نوبل پرائز حاصل کرنے کا یقیناً کوئی حق نہ تھا۔ آخر کار بہت کچھ غور و فکر کے بعد ہم سب اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کی بیان کی ہوئی خوبیوں کو سو پر تقسیم کر دیا جائے لیکن اس کا حاصل تقسیم بھی ایسا تھا کہ وہ عورت ہزار دو ہزار میں ایک تھی۔ اور تعجب تو یہ تھا کہ ان ایسے کندۂ ناتراش کو ایسی بیوی کہاں سے مل گئی مگر اسی کے ساتھ ساتھ ہم سب اس نتیجے پر پہنچے کہ اس شخص کو قابو میں لانے کی کنجی صرف یہ ہے کہ اس کی بیوی کی تعریفیں کرو اور اس سے کھاؤ۔ چنانچہ ایک دن پھر ہم نے طے پایا کہ آج ان کے گھر پہنچ کر کچھ شکم پری کی جائے لہٰذا ان سے ملتے ہی میں نے کہا۔

"اے بھائی اپنی بیوی کے ہاتھ کے ویسے ہی پان ایک مرتبہ پھر کھلا دو۔ واللہ اب تک مزہ یاد ہے۔"

کہنے لگے۔

"ابھی چلو اور وہ تو خود ہی تم لوگوں کو پوچھ رہی تھیں کہ خدا جانے وہ

لوگ کیسے ہیں بلکہ مجھ سے کہا بھی تھا کہ جا کر خیریت معلوم کر آؤ۔"

ہم لوگوں کو گویا منہ مانگی مراد ملی ان کے ہمراہ ہو لیے اور گھر پہنچتے پہنچتے راستہ میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ چلنے کی فرمائش بھی کر دی گھر پہنچتے ہی وہ تو اندر چلے گئے اور ہم سب باہر بیٹھے ہوئے طے کرنے لگے کہ آج دروازے کے سوراخ سے دیکھا جائے کہ یہ حضرت اور ان کی بیوی صاحبہ دراصل ہیں کیا اور کتنے پانی میں ہیں۔ بات تو یہ بری تھی لیکن ہم لوگ ٹھہرے شیطانی لشکر کے رضاکار ہم کو تو یہی فکر تھی کہ کس طرح اپنے دوست کی اصلیت معلوم کریں۔ لہٰذا شمیم فوراً دروازہ کے پاس گیا اور سوراخ سے گھر کی تمام کیفیت دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ ہم سب کو یہی شوق سوار ہوا اور سب دروازے کے پاس جمع ہو گئے۔ وہاں سے اندر کی ایک ایک چیز صاف نظر آ رہی تھی۔

ہمارے دوست نے جاتے ہی ایک مسکینی کے ساتھ اپنی بیوی سے کہا۔ "ذرا دو تین آدمی آ گئے ہیں ان کو چائے پلانا ہے چولہا تو میں خود بنائے دیتا ہوں البتہ باقی کام تم کر دو اور کہو تو میں ہی بنا لوں۔" بیوی نے ناک بھوں چڑھا کر سروتہ چارپائی پر پٹخا اور کہنے لگیں۔

"مجھے یہ چونچلے اچھے نہیں لگتے تمہارے دوست ہمیشہ فاقہ ہی سے آتے ہیں۔ ان کے گھروں میں کچھ نہیں جڑتا۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ جاؤ تم ہی بنو چائے کہ میری جوتی کو غرض نہیں پڑی ہے کہ اس گرمی میں چولہے

کے پاس جا کر مروں۔"

اس بے چارے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"خدا کے لیے آہستہ بولو۔ وہ لوگ یہیں کمرے میں بیٹھے ہیں میں خود سب کچھ کر لوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ باہر آنے لگا اور ہم لوگ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اس نے آتے ہی کہا۔

"بھائی وہ تو سب کو سلام کہہ رہی ہیں اور مزاج پوچھتی ہیں چائے ابھی آتی ہے۔ جب تک میں دو رکعت نماز پڑھ لوں۔"

یہ کہہ کر وہ پھر گھر میں چلا گیا اور ہم سب دروازے کے پاس آ گئے۔ بیچارے نے جاتے ہی پہلے تو تیلی مانگنا شروع کر دی اور پھر آگ جلا کر پانی رکھ دیا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ بصد دست بستہ بیوی کے حضور میں حاضر ہوئے کہ ذرا دو چار پان ہی لگا دو۔ گویا وہ تو خار کھائے ہوئے بیٹھی تھیں فوراً پان دان ان کے سامنے پٹخ کر کہا۔

"تم ہی بناؤ۔ مجھ سے یہ نہیں ہو گا کہ دن بھر تمبولن بنی بیٹھی رہوں اور تمہارے یار دوستوں کو گلوریاں بنا بنا کر دوں۔ کیا ان کم بختوں کے جیب میں ڈبیا بھی نہیں ہوتی۔ آگ لگے موؤں کو نہیں معلوم کہاں سے پھٹ پڑتے ہیں۔"

وہ بے چارہ بس یہی کہے جا رہا تھا کہ "خدا کے لیے چپکے چپکے، خدا کے

واسطے ذرا آہستہ، وہ سب سن رہے ہوں گے۔" اور وہ عورت بکے جا رہی تھی آخر بےچارے نے خود ہی پان بنائے اور باہر آنے لگا ہم سب اپنی اپنی جگہ پر آ گئے تھے۔ اس نے پان دیتے ہوئے کہا۔

تو بھائی "تمہاری بھاوج کہتی ہیں کہ آخر ان پانوں میں کون سی ایسی بات ہوتی ہے جو یہ بہت پسند آئے ہیں وہی معمولی کتھا چونا، پان، ڈلی اور بس۔"

ہم نے کہا۔ "مگر ان کو بنانے کی ترکیب تو سب کو نہیں آتی۔" خوش ہو کر کہنے لگے "ہاں یہی تو بات ہے۔ اچھا میں چائے لے آؤں۔"

وہ بےچارہ چائے لینے گیا تو بیوی نے کہا "دیکھو آج تو جو کچھ ہوا وہ خیر ہوا مگر میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ آئندہ سے میں یہ دعوتیں نہ ہونے دوں گی مجھے یہ روز روز کی باتیں اچھی نہیں لگتیں ان مرگھلوں کا کیا ہے۔ وہ تو چائے کے لیے آ ہی جائیں گے۔ واہ اچھا تماشا بنا رکھا ہے کہہ دینا کہ اب کبھی نہ آئیں۔"

وہ بےچارہ چائے کی کشتی لیے ہوئے ہاں ہاں کرتا ہوا باہر آ گیا اور کہنے لگا۔ "بےچاری نے جلدی جلدی چائے بنا دی ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ میں اس وقت ناشتہ کا انتظام نہ کر سکی۔ آپ لوگ معاف کیجئے گا دوسرے سہ پہر کی چائے میں جو ناشتہ ہوتا تھا وہ ایک دن کی بات سے ختم ہی ہو گیا ہے۔ بہرحال پیو۔"

ہم سب نے اس وقت تو چائے کو زہر کا پیالہ سمجھ کر کسی نہ کسی طرح پی

پی لیا، حالانکہ یہی معلوم ہو رہا تھا کہ جوتے کھاتے ہیں لیکن اس دن کے بعد سے انہوں نے بارہا کہا کہ "تمہاری بھاوج بہت یاد کرتی ہے"

لیکن ہم لوگوں نے ادھر کا رخ بھی نہ کیا وہ اب بھی اپنی بیوی کی تعریفیں کرتا ہے اور ہم سب اس کو قابل رحم سمجھتے ہیں ہنستے اس لیے نہیں کہ خود بھی بیوی والے ہیں کہیں خدا کو یہ شیخی بری نہ معلوم ہو۔

تار کا منی آرڈر

خداوندکریم واقعی مسبب الاسباب ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ جس کو دولت سے مالا مال کرنا چاہے، چھپر پھاڑ کر دے سکتا ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ ہم گھر میں بند ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہوئے بیٹھے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کیا کریں، کس طرح اپنا خرچ پورا کریں۔ قرض خواہوں کے مارے ناک میں دم تھا، گھر میں رہتے تھے تو نون تیل لکڑی کے تقاضے خودکشی پر آمادہ کرتے تھے۔ مجبوراً ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ نہ باہر نکلے نہ گھر میں بیٹھے بلکہ ان دونوں کے درمیان اپنی مردانی نشست گاہ میں اپنے کو ہر طرح سے محفوظ طریقہ

پر مسلط کر لیا اور بیٹھ کے ہندوستان کے اقتصادی مسئلہ کو حل کرنے لگے۔ ہندوستان کے موجودہ افلاس کو دور کرنے کے طریقوں پر غور کرتے کرتے ابھی ہم پورن سوراج ہی تک پہنچے تھے کہ کسی نے زنجیر کھٹکھٹائی اور ہم نے نفس کی آمد و شد میں بھی احتیاط برتنا شروع کر دی تاکہ زنجیر کھٹکھٹانے والے کو ہماری موجودگی کا شبہ نہ ہو۔ اس لیے کہ یہ طے تھا کہ زنجیر کھٹکھٹانے والا یا مہاجن ہے ورنہ آغا حشر در ہے جس کا روپیہ مع سود در سود آج ہم کو ادا کر دینا چاہیئے۔ ہم دم بخود کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور زنجیر کٹکٹانے والا نہایت مستعدی کے ساتھ زنجیر کا نگاٹا بجا رہا تھا۔ کبھی ہمارا نام لے کر آواز دیتا تھا اور کبھی اس زور سے زنجیر ہلاتا تھا کہ دروازے کی چولیں تک ہل جاتی تھیں۔ جب ہم کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص بغیر دروازہ توڑے ہوئے نہ مانے گا تو ہم نے فوراً ملازمہ کی آواز بنا کر کہا

"اے کون ہے؟"

جواب ملا "تار منی آرڈر ہے۔"

ہم کو فوراً ہنسی آ گئی۔ اس لئے کہ مسعود کو اس قسم کا مذاق ہمیشہ سوجھا کرتا ہے اور وہ بارہا تار کا منی آرڈر والا اور پوسٹ مین بن کر ہم کو بے وقوف بنا چکے تھے۔ لہٰذا ہم نے اس شرارت کو سمجھتے ہوئے اپنی اصلی آواز میں کہا۔

"ابے جا یہاں سے۔ اب ہم کیا ہمیشہ بے وقوف بنیں گے؟"

جواب:۔ مراد آباد سے تار کا منی آرڈر آیا ہے، بابو جی کو بھیجئے۔

ہم:۔ اچھا اب معاف کیجئے۔ بے وقوف بنانے کو ہم نے آپ کو پہچان لیا۔

جواب:۔ صاحب ہم کو دیر ہو رہی ہے گھنٹہ بھر سے چیخ رہے ہیں۔

ہم نے اٹھ کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "ابے مسخرے..." لیکن وہ واقعی منی آرڈر والا تھا جو ہم کو سلام کرتا ہوا کمرے میں آگیا اور تار کے منی آرڈر کا فارم ہم کو دیتے ہوئے کہا۔ "پانچ سو پچاس روپیہ بابو جی جلدی دستخط کر دیجئے۔"

ہم:۔ سنو تو بھائی کس کے نام ہے کیا میرے نام ہے۔

وہ:۔ اور کس کے نام ہوتا۔

ہم:۔ اور کس نے بھیجا ہے؟

وہ:۔ برجی مستری نے مراد آباد سے۔ بابو جی جلدی سے دستخط کر دیجئے۔

ہم:۔ کہیں غلطی تو نہیں .... مگر ہاں غلطی کیسے ہوتی نام تو میرا ہی ہے برجی مستری .... برجی مستری .... رحمت کا فرشتہ .... برجی مستری .... برجی مستری صاحب .... مکرمی برجی مستری صاحب .... بھائی برجی مستری .... عزیزم برجی مستری .... مائی ڈیر برجی مستری .... میری روح برجی مستری .... میری جان .....

وہ:۔ بابو جی لیجئے قلم دستخط۔

ہم:۔ ہاں ہاں لو... برجی مستری... میری امیدوں کا سہارا برجی مستری .... برجی مستری نزاد لطفہ.... لو بھائی یہ دستخط اور یہ ایک روپیہ انعام لے جاؤ۔

اب ہمارے ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈی اور چند روپیہ تھے ان کو گن بار گنا اور مبلغ پانچ سو انچاس روپیہ پایا۔ ایک روپیہ انعام دے چکے تھے۔ روپیہ کی تعداد کے متعلق اب ہم کو اس قدر یقین تھا کہ جس قدر اپنے وجود کا۔ لیکن برجی مستری کو ہم اب تک یاد نہ کر سکے کہ یہ کون رحمت کا فرشتہ ہے۔ لاکھ لاکھ ذہن پر زور دیا لاکھ لاکھ تمام مراد آبادی کی صف میں برجی مستری کو تلاش کیا۔ لیکن ان کا کہیں پتہ نہ تھا آخر ہم نے فیصلہ کر لیا اور ہمت نے گواہی دی کہ برجی مستری خزانہ غیب کے خزانچی ہیں۔ اور خداوند کریم نے اپنے اس گناہ گار بندے کی مجبوریوں اور تباہیوں کا اس طرح خاتمہ کیا ہے۔ اب ہم سے نہ رہا گیا اور ہم آنکھوں میں آنسو بھر کر سجدہ میں گر پڑے۔

ہمارا دور ابتلا ختم ہو چکا تھا اور اب ہم بفضلہ چار پیسے والے تھے۔ نہ ہم کو مہاجن کا ڈر تھا اور نہ آغا صاحب کا چنانچہ ہم نے سب سے پہلے ان ذلیل سرمایہ داروں کا قرض ادا کیا اور اس کے بعد اپنے گھر کے اس

باورچی خانہ کو آباد کرایا جو عرصہ سے ٹھنڈا تھا گھر میں ایک چہل پہل شروع ہو گئی۔ اور باہر مردانے میں بھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کھاتے پیتے انسان کا گھر ہے۔

جس نے بھی کہا ہے سچ کہا ہے کہ یہ دنیا بس روپیہ کا کھیل ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ جن بچوں کے پاس کل تک پھٹے ہوئے کپڑوں کی کمی تھی آج زرق برق لباسوں میں جگمگاتے پھر رہے ہیں۔ جن بیگم صاحبہ کا یہ حال تھا کہ قحط کی ماری ہوئی نظر آتی تھیں آج چکنی چپڑی بال بال موتی پروئے بیٹھی ہیں۔ خود ہم جو کل تک اس شرم سے باہر نہیں نکلتے تھے کہ دنیا ہم کو پھٹے حالوں دیکھ کر کیا کہے گی۔ آج اس لیے باہر نکلتے ہیں کہ راہ چلتے ہم کو دیکھیں اور ہماری شان اور شوکت کی داد دیں۔ یہ سچ ہے کہ پانچ سو کی حیثیت ہی کیا ہے۔ جس کے پاس پانچ کوڑیاں بھی نہ ہوں اس کے لیے تو یہ رقم قارون کا خزانہ ہے۔

اپنی اور بچوں کی حیثیت درست کرنے کے بعد ہم نے سب سے پہلے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے ان تمام دوستوں کو ایک جگہ جمع کریں جو ہمارے افلاس کی نحوست کی وجہ سے ہم کو نہ صرف چھوڑ چکے تھے۔ بلکہ ہمارے سایہ سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ آج خدا نے ہم کو اس قابل بنایا تھا کہ ان خودغرض مطلب شناس اور ابن الوقت دوستوں کو اپنے گھر بلا کر یہ ظاہر کر سکیں کہ انسان پر مصیبت ہمیشہ نہیں رہتی ہے اور کبھی نہ کبھی اس کے دن ضرور

پھرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ایک پرتکلف دعوت کا انتظام کر کے اپنے تمام دوستوں کو مدعو کر دیا۔ اور گھر میں عورتوں نے بھی میلاد شریف کر کے عورتوں کو بلایا مختصر یہ کہ اندر سے لے کر باہر تک اچھی خاصی شادی بیاہ کی سی چہل پہل ہو گئی اور ہمارے وہ تمام دوست جمع ہو گئے جو کل تک ہم کو اپنی بزم میں جگہ دیتے ہوئے بھی پیشانی پر سینکڑوں بل ڈال لیا کرتے تھے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ آج تمام گذشتہ ذلتوں کی تلافی ہو رہی ہے اور واقعی آج ہم کو محسوس ہو رہا ہے۔ کہ اگر کل تک ہم سب کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے تھے تو آج سب کی آنکھوں کا تارا بنے ہوئے تھے۔ یہ خوشی ہمارے لیے کچھ کم نہ تھی اور ہم دل ہی دل میں سینکڑوں شکر کے سجدے کر رہے تھے اور اپنے نادیدہ محسن برجی مستری کے جان و مال کو دعائیں دے رہے تھے۔ آج ہم زمانہ کی اس حالت سے درس عبرت لے رہے تھے کہ ہمارے یہ بھی دوست ہیں جو ہمیشہ ہمارے "ہم نوالہ اور ہم پیالہ" رہے لیکن وقت پڑنے پر ان میں سے ایک بھی نظر نہ آیا اور آج جب خدا نے ہمارے دن پھیرے ہیں تو یہ سب پھر ہم کو دوستی کے فریب میں مبتلا کرنے کے لیے جمع ہیں لیکن اسی دنیا میں برجی مستری کی طرح کے خدا کے نیک بندے اور انسانی صورت میں رحمت کے فرشتے بھی بستے ہیں۔ جن سے نہ کبھی شناسائی نہ کسی قسم کے تعلقات مگر آج اس نیکی کے فرشتے نے ہم کو حیات تازہ بخشی ہے ہم اس کے اس احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے اور اگر ہم شریف ہیں تو اپنے

محسن برجی مستری کے اس احسان کو کبھی نہ بھولیں گے۔ ہم اپنے گھر کی چہل پہل دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ ہم مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے تھے لیکن ہمارا دل چاہتا تھا کہ اس موقع پر برجی مستری بھی ہوتے تاکہ ہم ان کو سر آنکھوں پر جگہ دے کر ان کو کلیجہ سے لگا کر دل کی بھڑاس نکال لیتے اور ان تمام دوستوں کو بتا سکیں کہ اگر دنیا میں تم ایسے رہزن دوست ہوتے ہیں تو دنیا اس قسم کے سچے دوستوں سے بھی خالی نہیں ہے۔ ہم نے اب تک برجی مستری کو نہ دیکھا کیا معنی یہ نام بھی کبھی نہ سنا تھا لیکن آج ہمارے تخیلات نے برجی مستری کی ایک شکل پیدا کر لی تھی۔ اور ہم اس پیاری پیاری شکل کی پرستش کر رہے تھے۔

دعوت بخیر و خوبی ختم ہو گئی اور تمام شرکاء دعوت ہماری سرچشمی اور عالی حوصلگی کی داد دیتے ہوئے اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے۔ اب ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس غیبی امداد سے کس طرح فائدہ اٹھائیں اس لیے کہ اب ہمارے پاس پورے ڈھائی سو روپے محفوظ تھے اور یہ بالکل معمولی سی بات تھی کہ اگر ان روپوں کو بھی ہم خرچ کرنا چاہتے تو ایک ہی دن میں خرچ کر سکتے تھے لیکن سوال یہ تھا کہ اس رقم کے ختم ہو جانے پر آخر کیا کریں گے۔ لہٰذا ہم نے مناسب یہی خیال کیا کہ ایک معمولی سی اسٹیشنری کی دکان کھول دیں گے۔ اور اس کا نام اپنے محسن کے نام پر "مستری اینڈ کو اسٹیشنری فروش" رکھیں لیکن فوراً ہی یہ خیال ذہن میں آیا کہ اگر پرچون کی دکان رکھی جائے تو کم خرچ بھی ہو گی

اور بالانشین بھی۔ پھر اسی دکان کو ترقی دے کر ہم بڑے تاجر بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ بات ضرور تھی کہ پرچون کی دکان ذرا ہمارے پوزیشن سے گری ہوئی تھی لہٰذا ہم نے سوچا کہ بساط خانہ کی دکان رکھیں اور اس کا نام "برجی اینڈ کو" رکھیں۔ مگر تخمینہ کیا تو ڈھائی سو روپیہ اس کے لیے کافی نہ تھا۔ اسی طرح بزاز کی دکان اور انگریزی دواؤں کا مسئلہ خارج از بحث ہو گیا۔ کتابوں کی تجارت پر سب سے زیادہ دل نے گواہی دی۔ اس لیے کہ یہی وہ تجارت ہے جس سے نوعِ انسان کی خدمت بھی ہوتی ہے اور اس کو بہت کم سرمایہ سے شروع بھی کیا جا سکتا ہے لیکن جوتوں کی تجارت کے خیال نے بھی ایسے سبز باغ دکھائے کہ اب ہم نے "برجی بک ڈپو" اور "برجی شو فیکٹری" کا معائنہ شروع کر دیا اور ان دونوں کے رُخ پر کافی غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ برجی شو فیکٹری بسم اللہ کہہ کر کھول دیں پھر دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔

روپیہ ہونے کی دیر ہوتی ہے اور جہاں روپیہ ہاتھ میں آیا بس تمام انتظامات خود بخود ہو جاتے ہیں چنانچہ ہم نے دکان بھی کرایہ پر لے لی سنگر کی مشین بھی بہ قسط ادا کر کے لے آئے کاریگروں کا بھی انتظام ہو گیا اور اب ہم برجی شو فیکٹری کے پروپرائٹر تھے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جس خدا نے یہ تمام سامان اپنی غیبی امداد سے کر دیا ہے۔ وہی اس کام میں فائدہ بھی پہنچائے۔ اور جلد جلد دکان کو چلائے۔ اس لیے کہ اب تمام تر دار و مدار آمدنی پر تھا اور

اور دکان کی آمدنی ہی سے دکان کو چلایا جا سکتا تھا جہاں تک ہمارے سرمایہ کا تعلق تھا وہ سب اسی دکان میں لگ چکا تھا۔ اب ڈھائی سو روپیہ میں صرف پندرہ روپیہ گھر کے خرچ کے لیے پڑے ہوئے تھے۔ باقی سب برجی "شو فیکٹری" کی نذر ہو گئے تھے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جو کام بھی ہو رفتہ رفتہ چلتا ہے اور ہم کو اس کا پورالیقین تھا کہ جب خدا نے اس حد تک ہماری حالت بدلی ہے تو وہ ضرور اس دکان کو ہمارے دن بدل دینے کا بہانہ بنائے گا اور یہ جوتے کی کمپنی کامیاب ہو کر رہے گی۔

ہم کبھی یہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے ایک دم سے ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ اپنے پیروں پر اس بے نور کھڑے ہو سکیں، لیکن آج وہی ناممکن صورت ممکن ہو کر عملی صورت میں ہمارے پیشِ نظر تھی اور ہمارا دل چاہتا تھا کہ ان تمام دوستوں کو جو ہماری طرف سے بالکل مایوس ہو گئے تھے فرداً فرداً بلا کر دکھائیں کہ ہم کیا ہیں کیا ہو رہے ہیں کیا ہو سکتے ہیں۔ اور کیا ہو جائیں گے؟

ہم کو معلوم تھا کہ ہمارے اس ایک دم سے رنگ بدلنے پر ہمارے تمام دوست محوِ حیرت تھے اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے یعنی ؎

"یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا۔"

آج سے دو روز قبل ہم کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہ تھے لیکن دو ہی دن میں ہم نے پُرتکلف دعوتیں بھی کر ڈالیں۔ دکان بھی کھول لی اور آج نہایت

شان سے اپنی دکان پر آرام کرسی پر لیٹے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ ہمارا دل چاہتا تھا کہ وہ وجاہت پسند دوست اب ہم سے ملنے آئیں جو ہم کو اپنی سوسائٹی کے دامن پر ایک بدنما داغ سمجھتے تھے اور اب آ کر دیکھیں کہ کیا ہم ہی ان کی سوسائٹی کے لیے باعثِ فخر نہیں ہیں اور کیا ہم ہی سے ان کی سوسائٹی کی وقعت میں چار چاند نہیں لگ جاتے۔

ہم ان ہی خیالات میں گم حقہ کے کش لے رہے تھے کہ دھوئیں کی چادر سے ہم کو محسن آتا ہوا نظر آیا اور ہم "اخاہ محسن" کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے محسن آتے ہی ایک لوہے کی کرسی پر آرام کرسی کے سامنے بیٹھ گیا اور ہم آرام کرسی پر نہایت شان سے ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئے۔ محسن نے ہماری دکان کے چاروں طرف۔۔۔ اوپر نیچے ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اور کہنے لگا۔

"تم نے تو ایک دم سے بڑی ہوا باندھ دی۔"

ہم:۔ (ایک فخر آمیز انکسار کے ساتھ) کچھ نہیں یہ سب خدا کی ایک ادنیٰ سی عنایت ہے اور تمہاری دعاؤں کا اثر ہے۔

محسن:۔ خیر بھائی مبارک ہو اللہ تعالیٰ ترقی دے اور تمہیں کامیاب کرے۔

ہم:۔ آمین۔ انشاءاللہ تھوڑے ہی دنوں میں تم اس دکان کو باقاعدہ کارخانہ دیکھو گے۔ ابھی تو ابتدا ہے اور صرف میں تنہا کام کرنے والا ہوں اگر ابھی سے اندھا دھند روپیہ لگا دیتا تو حماقت ہوتی۔

محسن:۔ لیکن تم کو ذرا ظاہری شان و شوکت اور نمائش کا زیادہ خیال رکھنا چاہیئے کہ دکان جاذب نظر ہو۔

ہم:۔ تم اس معاملہ میں مشورہ نہ دو یہ بزنس ہے اور تم بزنس کے اصول سے واقف نہیں ہو۔ میں نے تو برسوں سر کھپایا ہے تب جا کر یہ دکان کھولی ہے۔ بزنس کا یہ اصول ہمیشہ یاد رکھو کہ تنزل سے ترقی کی طرف جانا چاہیئے۔ ترقی سے تنزل ہمیشہ کاروبار کو ختم کر دیتا ہے۔ تم کو نہیں معلوم کہ اس معاملہ میں مجھ کو کس قدر تجربہ ہے تم لوگ میرے پھٹے حالوں کے دیکھنے والے ہو۔ تم لوگ مجھ کو ایک قابل رحم مفلس سمجھتے تھے۔ لیکن میں اپنے ان ہی پھٹے حالوں میں اپنا اور بال بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر اس دکان کی تیاریاں کر رہا تھا اور تم ہی سچ بتاؤ کہ اگر میں نے یہ طریقہ اختیار نہ کیا ہوتا تو آج یہ دکان کہاں سے ہوتی۔ اب تم کو نہیں معلوم کہ اس دکان کے لیے میرے ذہن میں کتنا عظیم الشان پروگرام ہے لیکن میں زینہ بہ زینہ اس پروگرام پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ تمہاری دعا سے روپے کی کمی نہیں ہے لیکن اس روپے کے لیے جو مصرف بننا چاہیئے اس کو میں تم سے زیادہ سمجھ سکتا ہوں۔ تم کو کیا معلوم کہ بزنس میں انسان کو کیا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے؛

محسن:۔ ابے یار تم بڑے گہرے نکلے۔ ہم نے تم کو کبھی اس قسم کا ٹھوس آدمی

نہیں سمجھا تھا۔

ہم:۔ تو وہ تم کیوں کر سمجھتے بات یہ ہے کہ میں نے اپنا ہمیشہ یہی اصول رکھا کہ جو بھی کیا جائے نہایت خاموشی کے ساتھ اور قبل از وقت ڈینگ نہ ہانکی جائے۔ اب یہی دیکھو کہ تم کو ایک دم سے یہ دکان دیکھ کر خوشی ہوئی ہے یا اگر میں ہمیشہ دکان کا تذکرہ کرتا، بڑھ بڑھ کر باتیں بناتا تو یقین ہے کہ تم کو اس صورت میں ہرگز خوشی نہ ہوتی۔

محسن:۔ بھئی واللہ مجھ کو تعجب ہو رہا ہے کہ تم کتنے گہرے تجارتی انسان تھے۔ اور مجھ کو کیا کسی کو تم پر شبہ نہ ہوا۔

ہم:۔ تجارتی انسان کبھی اپنے راز کو افشا نہیں کرتا اور بزنس کا یہ اصول یاد رکھو کہ جو ڈینگیں ہانکے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

سن:۔ خیر بھائی۔ واللہ بڑی مسرت ہوئی۔ خداوند کریم تم کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔ اچھا اب چل دیے۔ ہاں اس وقت آنے کا مقصد یہ تھا کہ کوئی تار کا منی آرڈر تو نہیں آیا۔

ہم:۔ (ایک قہقہہ لگا کر) بدمعاش کہیں کے ... شریر ... تم شرارت سے کبھی باز نہیں آؤ گے۔ تم کو کیسے معلوم ہوا؟

محسن:۔ (سنجیدگی سے) واقعی مذاق نہیں۔ ایک منی آرڈر تمہارے چچا نے مراد آباد سے منگایا ہے۔ ابھی کو [illegible]

ہم:۔ اور ظالم کے چہرے پر ذرا بھی ہنسی کا نشان نہیں ... ہاہاہاہا ... شریر ... ہاہا ... ہو بُرے پاجی ... ابے سچ بتا تجھے کیسے معلوم ہوا؟

محسن:۔ بھائی قصہ یہ ہے کہ مراد آباد کا ایک ٹھیکیدار برجی مستری میڈیکل کالج میں پاور ہاؤس کا ٹھیکہ لینے والا ہے۔ اس نے ٹنڈر بھیجا ہے اور یہ زر ضمانت مجھ کو بھیج رہا تھا۔ میں الہ آباد جا رہا تھا تو میں نے تمہارے پتہ پر منگایا ہے اس کو اب تک آجانا چاہیئے تھا ورنہ آج آجائے گا۔

ہم:۔ ہاہاہا .... ابے ... ہاہا ... بس اب رہنے بھی دو۔ ہم کو اُلو بنانے آیا ہے۔ تجھے خدا کی قسم سچ سچ بتا کس نے تجھ سے کہا۔

محسن:۔ مذاق نہیں واللہ برجی مستری سے میں نے تمہارے پتے پر روپیہ طلب کیا ہے۔

ہم:۔ خیر اب مذاق تو ہوا ختم یہ کہو کہ تم کو کیسے خبر ہوئی یہ بات تو اب تک کسی کو نہیں معلوم۔

محسن:۔ آپ بھی عجب چیز ہیں میں تو کہہ رہا ہوں کہ خود میں نے برجی مستری کو لکھا ہے کہ زر روپیہ بذریعہ تار تمہارے پتہ پر بھیج دے اور مجھ کو کیسے معلوم ہوتا۔

ہم:۔ گدھا کہیں کا۔ ہم کہہ رہے ہیں کہ بس اب دل لگی ختم ہو گئی۔

محسن:۔ یقین نہیں آتا — تو یہ خط دیکھو برجی مستری کا خط ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ جتنا روپیہ زر ضمانت میں طلب کیا گیا ہو مجھ کو لکھو۔ میں بذریعہ تار بھیج دوں۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں تو الہ آباد جا رہا ہوں۔ وہ ساڑھے پانچ سو روپیہ بذریعہ تار فوراً تمہارے پتے پر بھیج دے۔

ہم۔ یہ بھی اچھی گڑھی۔

محسن:۔ لو یہ خط دیکھو میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔

یہ بات خود ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ خط دیکھ کر ہماری روح قفس عنصری سے پرواز کیوں نہیں کر گئی لیکن اتنا ہم کو ضرور ہوش ہے کہ خط دیکھنے کے بعد ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ اس قسم کا اندھیرا تھا کہ ہم محسن کی صورت نہ دیکھ سکتے تھے لیکن ہم نے نہایت مضبوطی سے کام لے کر اس وقت تو محسن کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی تک تو کچھ نہیں آیا ہے اور دوسرے دن باپ دادا کی کمائی کا آخری حصہ یعنی مکان کے سامنے پڑی ہوئی زمین ہم سے اس طرح جدا ہو رہی تھی کہ اس پر ایک اشارہ کھا ہوا ڈھول پیٹا جا رہا تھا اور ایک دفتی کے ٹکڑے پر لکھا تھا۔

"قطعہ اراضی برائے نیلام"

امرود کا چور

افرادِ ڈراما

جمیل	ایک شاعرانہ ذہنیت کا نوجوان
پروین	جمیل کی محبوب بیوی
شکیل	جمیل کا خورد سال بچہ
بدھو کی ماں	ملازمہ

منظر

(جمیل ایک امرود اچھالتا ہوا مکان میں داخل ہوتا ہے اور اس کو میز پر رکھ کر ہاتھ دھونے کی تلاش میں باورچی خانہ جاتا ہے۔ پروین ایک چارپائی

پر بیٹھی ڈلی کاٹ رہی ہے۔ شکیل میز کے نیچے بیٹھا جمیل کے جوتوں سے کھیل رہا ہے۔ بدھو کی ماں صحن میں جھاڑو دے رہی ہے اور کچھ گنگناتی جا رہی ہے۔ جمیل کی ایک آواز پر سب چونک پڑتے ہیں۔

جمیل:۔ کس نے اٹھایا؟

پروین:۔ (حیرت زدہ ہو کر) کیا؟

جمیل:۔ ارے ابھی تو یہاں رکھا تھا۔

پروین:۔ کیا رکھا تھا؟

جمیل:۔ اس جگہ یہیں میز پر میں نے خود رکھا ہے۔

پروین:۔ کچھ کہو تو سہی کیا رکھا ہے؟

جمیل:۔ ارے کہا تو میں نے امرود۔ ابھی میں لایا تھا۔ ابھی خود میں نے اپنے ہاتھوں سے رکھا ہے

پروین:۔ امرود کیسا؟

جمیل:۔ سفیدی مائل پیلے رنگ کا گول عمدہ تازہ دو پتوں دار۔

پروین:۔ کہاں سے لائے تھے؟ کب لائے تھے؟ کچھ تو کہو۔

جمیل:۔ میں چرا کر لایا تھا مگر وہ ہوا کیا؟ ہائے کیسا شاداب تھا۔

پروین:۔ جائے گا کہاں؟ لائے ہو تو یہیں ہوگا؟

جمیل:۔ اب تم ڈھونڈو، میں تو ایک ایک چیز دیکھ چکا۔ کیا اس کی خوشبو

پروین:۔ (بدھو کی ماں کو آواز دے کر) ذرا میز کے نیچے تخت کے اوپر بکس کے پیچھے تو ٹلی دیکھ دے۔ شاید کہیں گر پڑا ہو۔

بدھو کی ماں۔ بیگم صاحبہ میز کے نیچے تو ابھی جھاڑو دی ہے۔ ہوتا تو اس کوڑے میں ہوتا۔ تخت کے اوپر دیکھئے کوئی چیز ہے نہیں۔ بکس کے پیچھے لائیے دیکھ لوں؟

جمیل:۔ تو گویا میں جھوٹا ہوں؟ پاگل ہو گیا ہوں؟ دماغ خراب ہے؟

بدھو کی ماں:۔ نہیں میاں خدا نہ کرے۔ میں تو امرود موئے کو کہتی ہوں کو غائب کیسا ہوا؟

پروین:۔ اور کوئی آس نہ پاس۔

جمیل، تو کیا اس کے نو دو پر لگ گئے تھے۔ زبانی جمع خرچ کر رہی ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ اٹھ کر ڈھونڈ دیں۔

پروین:۔ لے واہ جیسے میں نے کھو دیا ہے۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ کیسا معا امرود اور کیسا کچھ مجھ پر کیوں غصہ آ رہا ہے۔

جمیل:۔ غصہ نہ آئے تو اور کیا ہو۔ گھر ہے کہ سرائے۔ چیز رکھی اور اڑ گئی۔ آنکھوں کا کاجل نکالا جاتا ہے۔

پروین:۔ تو کس نے چرایا۔ میں نے؟

جمیل:۔ میں کیا جانوں۔ اب یہاں میرے اور تمہارے سوا کون تھا؟

بدھو کی ماں:۔ میاں بدھو کی جان کی قسم اگر میں نے امرود دیکھا بھی ہو تو آنکھیں پھوٹ جائیں۔

جمیل:۔ تو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

پروین:۔ تم یاد بھی کر کے لائے بھی تھے یا نہیں اور کہیں کھا کر تو نہیں بھول گئے ہو؟

جمیل:۔ لاحول ولاقوۃ۔ تم لوگ مجھ کو دیوانہ سمجھتی ہو کیا؟

پروین۔ تم کو غصہ چلا آ رہا ہے۔ ذرا اپنی جیبیں دیکھ لو۔ باورچی خانہ میں دیکھ لو۔

جمیل:۔ (جیبیں دیکھ کر) جیب میں امرود ہوتا تو تمہی سے پوچھتا؟ گویا امرود کیا ہوا گاجر ہو گیا

پروین:۔ اچھا تو باورچی خانہ میں ڈھونڈیئے۔

جمیل:۔ مگر تم کو قسم ہے کہ بیٹھے بیٹھے حکم چلا دیں گی۔ اگر مل گیا تو میں اکیلا تھوڑا ہی کھا لوں گا۔ تمہیں دوں گا۔ شکیل کو دوں گا مگر کہیں ملے بھی۔

بدھو کی ماں:۔ کھو گیا جائے بھاڑ میں۔ میں بازار سے اور لائے دیتی ہوں۔

جمیل:۔ بے وقوف کہیں کی۔ بدتمیز۔

بدھو کی ماں:۔ حضور میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی۔

پروین۔ اچھا چپ رہو۔ غصہ تھوک دو۔

جمیل:۔ یعنی یہ گدھی کہتی ہے کھو گیا تو کیا ہوا۔ ایسا امرود تو ایک روپے کا بھی نہیں ملتا۔ تم نے اس کی بدتمیزی پر غور نہیں کیا۔

پروین:۔ تو اس کو کیا پتہ کہ کیسا امرود تھا۔ یہ سمجھیں کہ روپے کے آٹھ والے ہوں گے۔

جمیل:۔ اس پر مجھ کو غصہ کیوں نہ آئے کہ وہ امرود خسرو باغ الہ آباد سے مولوی اشفاق اللہ خان نے اپنے ایک دوست کو بھیجا تھا اور ان کو لکھ دیا تھا کہ وہ مجھ کو بھی دے دیں۔

پروین:۔ ان کو ایک امرود کے لیے لکھتے ہوئے شرم نہیں آئی؟

جمیل:۔ بات اصل میں یہ تھی کہ شہر لکھنؤ میں ان کے ہزاروں دوست ہیں۔ انہوں نے کہا سارے دوستوں میں تقسیم کر دو۔ لہٰذا حصہ رسد ایک سے زیادہ نہ آتا تھا۔ اس کو کیا کیا جائے۔

پروین:۔ خیر جی اب تو وہ کہیں نہیں ملا۔

جمیل:۔ آنکھیں کھول کے اگر ڈھونڈا جائے تو ابھی ملے یہیں ملے۔

بدھو کی ماں:۔ میاں میں ہلکان ہو گئی۔ اب موئے کو کہاں ڈھونڈا جائے۔

جمیل:۔ (پروین سے) دیکھو شاید تمہارے پائنچوں میں ہو۔

پروین۔ (دونوں پائنچوں کو جھٹک کر) لو۔

جمیل:۔ اب تکیے کے نیچے دیکھو۔

پروین:۔ (تکیے ہٹا کر) دھرا ہے یہاں۔

جمیل:۔ اچھا۔ اچھا۔ ہاں شکیل کے بستر پر بھی لگے ہاتھ دیکھ لو۔

پروین:۔ اوہ شکیل ہے کہاں؟

جمیل:۔ ہوگا کہیں پہلے امرود دیکھ لو۔

پروین:۔ واہ اس کی بڑی دیر سے خبر نہیں ہے۔

جمیل:۔ باہر ہوگا پہلے امرود ڈھونڈھو۔

پروین:۔ چولھے میں گیا امرود کہیں میرا بچہ سڑک پر نہ چلا جائے

جمیل:۔ نہیں جائے گا۔ اس کا لحاف اٹھا کر امرود دیکھو۔

پروین:۔ اسے میں دیکھ دوں گی پہلے اس کو۔

جمیل:۔ لاحول ولا قوۃ، میں خود دیکھوں گا۔

پروین:۔ (بدھو کی ماں سے) ذرا تو جا کر اس کو اٹھا لا۔

جمیل:۔ جی ہاں تاکہ میرا امرود باہر جا کر کھائے۔

بدھو کی ماں:۔ میاں میری تلاشی لے لیجئے بدھو کی قسم میں نے امرود نہیں لیا۔

جمیل:۔ کھا گئی ہوگی۔ اچھا لا تیرا منہ سونگھوں۔

بدھو کی ماں:۔ (منہ کھول کر) لیجئے

جمیل:۔ (منہ سونگھ کر) استغفر اللہ کبھی منہ بھی صاف نہیں کرتی دور ہو

پروین:۔ (ہنس کر) تو تم سے کس نے کہا تھا کہ منہ سونگھو اور میرا بھی سونگھنا ہو تو

سونگھ لو۔

جمیل:۔ بس معاف رکھو۔ تمہارا منہ سونگھ کر مر ہی جاؤں گا۔

پروین:۔ اے واہ تو کیا میرا ابھی منہ بدبودار ہے۔

جمیل:۔ خیر خوشبودار سہی مگر میرا امرود۔

پروین:۔ اچھا بدھو کی ماں تو شکیل کو لے آ۔

جمیل:۔ ہاں وہ جاتی ہے تم جہاں جہاں میں کہوں دیکھ تو لو۔

پروین:۔ بتاؤ اب کہاں دیکھوں۔

جمیل:۔ پاندان میں، پٹاری میں اور کتابوں کے پیچھے۔

پروین:۔ (پاندان کھول کر) اس میں کہاں سے آیا۔

جمیل:۔ اچھا پٹاری میں دیکھو۔

پروین:۔ (پٹاری کھول کر) نہ اس میں ہے۔

جمیل:۔ کتابوں کے پیچھے۔

پروین:۔ (کتابیں ہٹا کر) نہ یہاں ہے۔

(بدھو کی ماں آتی ہے)

بدھو کی ماں:۔ بھیا باہر نہیں ہیں۔ میں نے سب جگہ دیکھ لیا۔

جمیل:۔ اچھا میں فال کھولتا ہوں۔

پروین:۔ چولھے میں گئی فال میرے بچے کا پتہ نہیں۔

جمیل:۔ ابھی ڈھونڈ لاؤں گا پہلے ایک کیل اور ایک جوتا لاؤ فال کھولوں۔

پروین:۔ اچھا تم شکیل کو ڈھونڈ لاؤ میں امرود ڈھونڈھے دیتی ہوں۔

جمیل۔ اب تو میں فال کھولوں گا۔ لاؤ جوتا لاؤ کیل۔

پروین:۔ کہیں گاڑے گھوڑے کے نیچے اس کے دشمن کچل نہ جائیں۔

جمیل:۔ (بدھو کی ماں سے) ایک جوتا لاتی ہے کہ نہیں اور ایک کیل۔

بدھو کی ماں:۔ (میز کے نیچے جوتوں پر پڑے ہوئے شکیل کو دیکھ کر) بھیا تو یہ سو رہے ہیں۔

پروین:۔ کہاں؟

بدھو کی ماں:۔ یہ ہیں یہاں جوتوں پر۔

پروین:۔ (شکیل کو اٹھا کر) میرا بچہ۔

جمیل:۔ (شکیل کو دیکھ کر) دیکھنا اس کے ہاتھ میں کیا ہے۔

پروین:۔ (ہاتھ دیکھ کر اور قہقہہ لگا کر) امرود۔

جمیل:۔ کیا امرود؟

پروین:۔ ہاں امرود۔

جمیل منہ کھول کر رہ جاتا ہے۔ پروین ہنستی ہے۔ شکیل آنکھیں کھول دیتا ہے اور ہاتھ چاٹنے لگتا ہے۔ بدھو کی ماں بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

بُوا جعفری خانم

اب تو خیر ہماری ہی بیگم صاحبہ کی حکومت ہے لیکن یہ اس زمانہ کا ذکر ہے۔ جب باورچی خانہ کی سولہ آنہ مالک و مختار بوا جعفری خانم تھیں اور ہمارے اغراض و مقاصد بھی آج کل سے زیادہ باورچی خانہ اور بوا جعفری خانم سے وابستہ تھے۔

سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ بوا جعفری کی پوزیشن واضح کر دی جائے۔ تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ وہ کس پایہ کی عورتوں میں سے تھیں اور ان کا کیا مرتبہ تھا۔ تھیں تو وہ تین روپیہ ماہوار اور کھانے پر ملازم اور اپنے عہدہ کے اعتبار سے بھی ماما سے زیادہ کہے جانے کی مستحق نہ تھیں لیکن انہوں نے ہماری والد کا کچھ ایسا اعتماد حاصل کر لیا تھا کہ وہ ہمارے گھر کی اسپیشل منیجر معلوم ہوتی تھیں اور دیکھنے والے ان کو ہماری

والدہ صاحبہ کی وزیر اعظم سمجھ سکتے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ باورچی خانہ کی تو وہ گویا مالک ہی تھیں اور وہاں گویا انہیں کے نام کا سکہ چلتا تھا لیکن چونکہ وہ گھر کے دوسرے انتظامات اور ہماری خاندانی سیاسیات میں دخل رکھتی ہیں۔ لہٰذا انہوں نے باورچی خانہ ہی کو اپنا ہیڈ کوارٹر مقرر کیا تھا اور وہیں تمام معاملات پیش ہو کر منظور یا نامنظور ہوتے تھے چنانچہ اس زمانہ میں ہمارے باورچی خانہ کی حیثیت بالکل دارالعوام کی سی تھی جس کی صدر بوا جعفری خانم تھیں۔

شادی بیاہ کے معاملات، ہم لوگوں کی تعلیم و تربیت کے مسائل، معمولی تنازعات، بڑے بڑے خاندانی اختلافات، آمدنی اور خرچ کے حسابات، بجٹ کی منظوری، مختصر یہ کہ تمام دنیا کے قضیے باورچی خانہ ہی میں طے پاتے تھے اور بوا جعفری خانم ہی طے کرتی تھیں۔ لاکھ کوئی اختلاف کرے اپنا سر پٹے مارے اور دوسروں کا سر توڑ دے اپنی بوٹیاں چبائے لیکن نتیجہ ہمیشہ یہی برآمد ہوتا تھا کہ بوا جعفری خانم کی تجویز والدہ صاحبہ کی نظروں میں مناسب ترین ہوتی تھی اور والدہ صاحبہ تو گویا اس دارالعوام کی کارروائی پر رسمی طور محض گویا دستخط فرما دیا کرتی تھیں۔ بہرحال بوا جعفری خانم کا فرمان ہم سب کا نوشتہ تقدیر بن کر رہتا تھا اور باورچی خانہ کا فیصلہ قطعی ہوتا تھا جس کی کہیں اپیل بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی صورت میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے گھر میں باورچی خانہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ہوتا یہ تھا کہ باورچی خانہ کی محدود گنجائش میں کھانے پکانے کے

کے سازوسامان کے علاوہ کہیں تو کسی کی چارپائی پڑی ہوتی تھی اور کہیں کسی کی کرسی کوئی پیڑھے ہی پہ بیٹھ جاتا تھا اور کوئی اُس سرکار میں ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا۔ بہرحال تمام گھر سمٹ سمٹا کر جس ایک مرکز پر نظر آتا تھا وہ باورچی خانہ کا ہی تھا۔ لیکن اس کے علاوہ ملاقات کے کمرے، آفس، خواب گاہ، ہسپتال درزی خانہ، رنگریزی کے کارخانے، ڈریسنگ روم بلکہ بعض اوقات بچوں کے غسل خانے اور پاخانے کی حیثیت بھی اسی باورچی خانے کو حاصل ہوتی تھی۔ چولھے کی داہنی جانب رکھا ہوا پیڑھا گویا کرسی صدارت تھی جس پر بوا جعفری خانم بصد شان و شوکت جلوہ فرما رہتی تھیں۔ اور ان کے اقبال سے تمام باورچی خانے کے کام ہوتے رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے معاملات بھی طے ہو جایا کرتے تھے وہ اپنے اس پیڑھے پر بیٹھی ہوئی چولہا ہانڈی بھی دیکھتی تھیں گھر کے دوسرے ملازموں کی نگرانی بھی کرتی تھیں۔ بچوں کی دیکھ بھال بھی فرماتی تھیں۔ گوشت والے اور دودھ والے پر غصہ بھی کرتی تھیں۔ گھی والے کے حسابات بھی طے فرماتی تھیں۔ ہم سب کو تنبیہ بھی کرتی تھیں۔ گیلی لکڑیوں کی شکایات بھی۔ لکڑی والے کی شان میں قصیدہ بھی فرماتی تھیں۔ خود لکڑیوں کو گالیاں بھی دیتی تھیں۔ طوطے کو سبق بھی پڑھاتی تھیں اور کتے کو "کم آن" اور "گو آن" کا مفہوم بھی سمجھاتی تھیں۔ موسیقی کی مشق بھی فرماتی تھیں اور کہانی بھی کہتی تھیں گھر کی سیاسیات پر لیکچر بھی دیتی تھیں اور اگر ضرورت

پیش آئے تو قسمت کو وہیں بیٹھ کر رو بھی لیتی تھی۔ ہر قسم کے مشورے اپنے اسی پیڑھے پر دیتی تھیں اور تمام احکام وہیں سے نافذ ہوتے تھے۔ مختصر یہ کہ ہمارے گھر کا مرکز باورچی خانہ تھا اور باورچی خانے کا مرکز وہ پیڑھا تھا جس پر بوا جعفری خانم تشریف رکھتی تھیں۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ ہم مبالغہ کر رہے ہیں۔ بہرحال یہ تو آپ کی سمجھ کا قصور ہوگا۔ ورنہ واقعہ تو یہی ہے کہ بوا جعفری خانم کی خداداد قابلیت اور اعلیٰ تدبر نے ہمارے باورچی خانہ کو دنیا بھر کی حیثیتیں بخش دی تھیں اور خود ان کا یہ حال تھا کہ وہ ہر ضرورت پر اس ضرورت کے عین مطابق کار آمد وجود ثابت ہوئی تھیں۔ مثلاً کسی نوکر نے غبن کیا اور جرم اس پر ثابت ہو گیا۔ اس وقت اگر کوئی بوا جعفری خانم کے تیور ان کا انداز بیان ان کے ذمہ دار الفاظ اور ان کی آواز کی گرج دیکھتا تو صرف یہی سمجھ سکتا تھا کہ آپ یقیناً تھانہ دار ہیں۔ خود ملزم کا تو یہ حال ہوتا تھا کہ گویا کوتوالی میں کھڑا ہے اور کوتوال صاحب سے مقابلہ ہے۔ اس طرح اگر کسی بچہ کو چوٹ آ گئی ہے تو بوا جعفری خانم ہی کی طبی امداد سب سے پہلے طلب کی جاتی تھی اور وہ بھی اس مستعدی کے ساتھ مرہم پٹی فرماتی تھیں کہ گویا پانچ سال تک میڈیکل کالج میں پڑھ چکی ہیں۔ اور سینکڑوں مریض آپ کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں اور اس طرح انجینئرنگ قانون، ادبیات، سیاسیات، مذہبیات، معاشیات، فلکیات، معدنیات

اور نہیں معلوم کن کن واہیات و خرافات پر وہ پورا عبور رکھتی تھیں۔ اور کہیں بھی وہ مجسمہ نظر نہ آتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ گھر کا ہر چھوٹا بڑا آیا گیا ان کا احترام کرتا تھا اور جس نے کبھی ان کو نظرانداز کیا وہ اپنی سزا کو بھی پہنچ جاتا تھا۔

ان کی مزاجی حالت عام انسانوں کی طرح ہر وقت مختلف ہوتی تھی۔ اور چونکہ تمام گھر ان ہی کے تابع فرمان تھا۔ لہٰذا ان کی مزاجی کا اثر تمام گھر پر پڑتا تھا۔ اگر کبھی وہ خوش ہوتی تھیں تو گھر بھر میں چہل پہل نظر آتی تھی اور خود وہ باورچی خانہ میں بیٹھے بیٹھے نغمہ سرائی فرماتی تھیں اور تمام غم کی نفساؤں کو ہمہ نغمہ اور ہمہ موسیقی بنا دیتی تھیں سوائے ان کی " اوری نندیا اوری سوتیا ہیں تو لیموں تو بلا کا نگنا " کی کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ طبلہ کی تھاپ سینی پر پڑتی تھی۔ گنگریاں تو خیر اپنے نشیب و فراز کے ساتھ باورچی خانہ یا زیادہ سے زیادہ گھر کی چہار دیواری کے اندر گونج کر رہ جاتی تھیں لیکن جب تک وہ تان لگاتی تھیں تو تمام محلہ میں بارشِ نور ہو جاتی۔ ان کے اس عالم وجدان میں ہر ایک کو منہ مانگی مراد ملتی تھی نہ کسی سے کوئی بازپرس ہوتی تھی نہ کسی سے کوئی غصہ اور نہ کوئی ان کے تیوروں سے ڈرتا تھا، نہ کوئی برتاؤ سے رنجیدہ ہوتا تھا بس اس وقت تو ان کا جی چاہتا تھا کہ جتنے گانے یاد تھے سب ہی آج گا کر رکھ دوں پھر خدا جانے زندگی

رہے یا نہ رہے۔ چنانچہ اس جشن کے دن مختلف قسم کی ٹھمریاں، دادرے، غزلیں، تھیٹر کی پیبنریں، ہیجڑوں کے گانے، گراموفون کے راگ، ایک آدھ مزاحیہ غزل کچھ ڈومنیوں کی سمدھن کر دینے والی منظوم گالیاں وغیرہ سننے میں آجاتی تھیں کبھی "گذر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے" چھیڑ دیا تو کبھی "تیری ذات پاک ہے اے خدا! تیری شان جل جلالہ" شروع کر دیا تو کبھی مہاراجہ کوڑیا کھول رس کی۔ . . . . . بوندیاں گریں" سے فضاؤں کو معمور کر دیا تو کبھی " ہریالہ بریلی والا وہ تو آنگن میں لا لے لگا دے" سے کائنات کو مرقص کر دیا۔ کبھی " جیرا ہلے مڈ دیے ہو" گانے لگیں تو کبھی " بالو شاہی کی ٹکیاں سیاں لا لوری" میں موسیقی کے کمالات دکھانا شروع کر دیے۔ غرضیکہ اس دن یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ تان سین کی قریبی عزیز ہیں اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایسی باکمال مغنیہ ہمارے گھر کی ماما ہے۔ اس دن وہ ہنستی بھی تھیں اور قہقہے بھی لگاتی تھیں لیکن کیا مجال ہے جو ان کے گانے پر کوئی اعتراض کر دے۔ حالانکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ ہمارے بڑے بوڑھے یعنی والد صاحب قبلہ اور ماموں صاحب مدظلہ العالی اگر کسی اور کو اس طرح میں گاتے ہوئے سنتے تو شاید اس کا دم ہی نکال لیتے لیکن گانے والی تھیں بوا جعفری خانم جو کم سے کم اتنا رعب رکھتی تھیں کہ سب ان کا گانا سنتے تھے مگر کوئی دم نہ مار سکتا تھا اور اگر کوئی دخل دے بیٹھتا تھا تو بس اس کی شامت ہی آجاتی تھی حالانکہ یہ تمنا ذرا کم ہوتی تھی کہ کوئی بیٹھے بٹھائے یہ کم بختی مول لے۔ اس لیے کہ سب جانتے

تھے کہ اگر خدانخواستہ کہیں ان کی مزاجی حالت میں کوئی تغیر پیدا ہوا تو یہی بہشت جہنم بن جائے گا۔ اور اس جہنم کے عذاب تمام گھر پر نازل ہوں گے۔ ان کے غیض و غضب کا عالم کوئی فراموش کر دینے والی چیز نہ تھی اور ہر وقت سب ڈرتے ہی رہتے تھے کہ کہیں ناک پر مکھی نہ بیٹھ جائے لیکن باوجود اس احتیاط کے غصہ اپنے وقت پر آتا تھا اور اس کا آنا برحق سمجھا گیا تھا۔ کچھ نہیں تو برسات کی گیلی لکڑیوں کو سلگانے کی کوشش میں جب وہ حسب دلخواہ کامیاب نہ ہوتی تھیں اور تھوڑی دیر تک پھکنی میں منہ لگا کر "پھوں پھوں" کرنے کے بعد بھی آنچ نہ نکلتی تھی تو بس وہیں سے ان کی پیشانی پر شکنیں پڑ جاتی تھیں اور ہم سب آنے والے طوفان کے منتظر ہو جاتے تھے کہ وہ "پھوں پھوں" کرنے کے بعد بھی بجائے آنچ کے چولھے سے دھواں نکلتے دیکھ کر بس ناچ ہی تو جاتی تھیں۔ اس وقت کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ چولھے میں منہ ڈال کر پہلے تو لکڑیوں پر تھوکتی تھیں کہ "تھو ہے تیری اوقات پر، اب کیوں جلے گی حرامزادی تو،" خدا غارت کرے اس موئے مولا بخش کو، اللہ کرے اس کی بھی ایسی ہی آنکھیں پھوٹیں جیسے اس موئے نے میری آنکھیں پھوڑی ہیں جیسے ہم نے تو دام دکے نہیں تھے۔ بھیک مانگ لائے تھے اس موئے کے یہاں سے اور ہم سے کیا مطلب، ہم تو نوکر چاکر ہیں جس طرح بھی ہو مصیبت جھیلیں گے جب گھر کے مالکوں ہی کو پرواہ نہ ہو گی تو اس موئے کی ہوتی کیا غرض پڑی ہے جو سوکھی لکڑیاں دے۔ آج ہی یہ لکڑیاں اگسا

مونڈی کاٹے کے منہ پر جا کے کوئی مار آئے تو پھر کبھی یہ پانی کی ڈوبی ہوئی لکڑیاں نہ آئیں گی مگر وہ تو خود مجھ کم بخت سے ہے کہ "اے حرامزادی تو ہی مر آنکھیں پھوڑ کر اور کتے کا بھیجا بنا کر چولھا پھونکے جا۔ تو یہ ہے بیوی میں نے ایسا بیڈھنگا کارخانہ دنیا جہان میں نہیں دیکھا اور مجھ کو کیا خود ہی کھانے میں دیر ہو گی۔ میں کیا کوئی اپنی بوٹیاں کسی کو کھلا دوں گی یا اپنے ہاتھ سلگا کر ہانڈی پکاؤں گی۔"

اور اس کے بعد پھر ان کے لیے ہر بات اشتعال انگیز اور ہر چیز لڑائی کی جڑ بن جاتی تھی۔

"یہ موا گوشت آیا ہے جیسے کتے کا راتب ہو، حرام کے پیسے ہوتے ہیں۔ پھر مٹھی بھر دام لیے اور چھیچھڑے دید کے جیسے دینے والے ایسے ہی اندھے لانے والے اور پھر ہانڈی خراب ہو جائے تو جعفری کی خطا، تو کیا جعفری اپنا گوشت پکائے۔"

"ابھی تک دہی کا پتا نہیں ہے۔ دہی لینے کیا گئے کہ جیسے مر ہی گئے ہے دہی بھی جیسے کوئی اندلان میں ختلہ ہے کہیں بیٹھے ہوں گے ان کو کیا دیر ہوئی تو آگ لگی ہمارے سر جائے گی۔ ان کی جوتی کو کیا غرض۔"

اور یہ مرغیاں الگ ناک میں دم کئے ہیں۔ ان کم بختوں کا بھی باورچی خانہ ہی میں ٹھکانا ہے۔ تمام دنیا کی مرغیاں گھر کے باہر نکال دی جاتی ہیں مگر جانے یہاں کی مرغیاں بھی نرالی ہیں کہ سر پر موجود ہیں۔ بلی بھی ان کم بختوں کو نہیں پوچھتی۔ اب کوئی پوچھے کہ میں ہانڈی چولھا دیکھوں یا مرغیوں کو ہنکارتی رہوں۔"

"برتن الگ بھنک رہے ہیں۔ سب کو تو یہ آتا ہے کہ ایک ایک برتن نکالتے جاؤ اور ڈھیر کرتے جاؤ۔ ان کو اس سے کیا جو کوئی دھوئے گا اس کے سر مصیبت رہے گی۔ ہم برتن دھوتے دھوتے مر جاتے ہیں اور یہاں کسی کو پرواہ بھی نہیں ہے۔ ابھی سویرے ہی سب برتن دھلے تھے۔ اب پھر سب ڈھیر ہیں ... واہ۔"

"چپ موئے تو نے اور ٹین ٹین" کر کے دماغ خالی کر رکھا ہے۔ نہ کلمہ نہ کلام بس ہر وقت "ٹیں ٹیں" "آگ لگے تیرے ٹیں ٹیں کو جھلسا پڑتے۔"

"یہ ہمارے گھر کا ڈسپنا ہے۔ موئے کی ٹانگیں چڑی ہوئی ہیں۔ نہ آگ نکلتے بن پڑتی ہے، نہ کچھ، ہاتھ الگ جلتے ہیں نا ــــ ہزار دفعہ کہا ایک "ڈسپنا" آ جائے یا اسی کو ٹھیک کرا دیا جائے مگر وہ تو مجھ سے ضد ہے کہ جل چڑیل اور اپنے ہاتھوں کو جھلسا ہم سے نہیں ہو گا اس موئے سے کام۔"

"بمبا الگ سے بند ہو گیا۔ پانی کی ایک بوند بھی نہیں ہے۔ اب کیا میں اپنے سر سے ہاتھ دھوؤں، سویرے سے چیخ رہی تھی کہ بمبا بند ہو جائے گا، تھوڑا سا پانی بھر لیا جائے مگر میں تو جیسے کتیا تھی بھونکا کی۔ اب ہم بھی بیٹھے رہیں گے آخر ہم کریں تو کیا کریں۔"

مختصر یہ کہ جو چیز بھی ان کے سامنے آ گئی۔ اس کے متعلق ایک تبصرہ فرما دیا اور ہر ایک چیز کے اس رخ کو بحث میں لے جائیں جو بات تو واقعی قابل اعتراض ہوتا

تھا۔ ورنہ ان کے تبصرے سے قابل اعتراض بن جاتا تھا۔ بہر حال یہ وقت وہ ہوتا تھا کہ گھر کے بوڑھے جوان بچے مرد عورت سب اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ مائیں اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیتی تھیں۔ بچے اپنے ماؤں سے سہم کر لپٹ جاتے تھے۔ بیویاں اپنے شوہر کی حفاظت میں آ جاتی تھیں اور شوہر بیچے دل سے خدا کو یاد کرتے تھے۔ طوطا بولنا چھوڑ دیتا تھا۔ کتا باہر بھاگ جاتا تھا۔ سونے والے جاگ اٹھتے تھے اور جاگنے والے بھاگنا چاہتے تھے لیکن اس عالم میں کوئی بہادر اور شریر لڑکا اپنی جان پر کھیل کر بھوک سے بے تاب ہو کر باورچی خانہ میں جا کر کھانا مانگ بیٹھتا تھا تو گویا توپ کا دہانہ اسی طرف پھیر دیا جاتا تھا۔

"تو کیا میں ہاتھوں میں مشین لگا لوں جو تم آ گئے۔ ہاتھ پیر پھیلانے اور ہتھیلیوں پر سرسوں جماتے ہو بھیا۔ ابھی کوئی ایسی دیر بھی تو نہیں ہو گئی ہے اور ہو گئی ہے تو میں کیا کروں اپنا سر چولہے میں جھونک دوں گی۔ ابھی تم کو کھانا کھائے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ ہر وقت کھانا ہر وقت کھانا۔ کھانا نہ ہوا آفت ہو گئی۔"

اولاد کے معاملے میں ماں تو اندھی ہوتی ہے۔ [illegible] لڑکے کی والدہ [illegible] اپنی ممتا سے [illegible] ہو کر بول اٹھیں کہ

"دن کو نہ [illegible] وقت لگا کرتا ہے جو تم ان [illegible] کم بخت۔ اس طرح مانگتا اور نہ یہ باتیں سنتا۔"

بس اس کے بعد سے باورچی خانہ میں ایک زلزلہ اور ایک طوفان اور ایک قیامت۔ ایک قیامت اور ایک قیامت بالائے قیامت کی کیفیات کے ساتھ ساتھ رونما ہو جاتی تھیں۔ بوا جعفری خانم ایک زخم خوردہ شیرنی کی طرح باورچی خانہ کی زمین کو آسمان سے اور آسمان کو زمین سے ٹکرا کر رکھ دیتی تھیں۔

تھوڑی دیر تک تو ان کی مدمقابل یعنی کھانا مانگنے والے صاحبزادے کی والدہ مقابلہ کرتی رہتی تھیں لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ تھک کر اعتراف شکست کر لیتی تھیں۔

لیکن بوا جعفری خانم کا توپ خانہ برابر گولہ باری کرتا رہتا تھا۔ وہ بڑبڑاتی تھیں، چیختی تھیں، پیٹتی تھیں، روتی تھیں اور آخر کار منہ پھلا کر اپنا پاندان لیے ہوئے اپنے پلنگ پر اٹواتی کھٹواتی لے کر پڑ جاتی تھیں۔ گویا احتجاجاً استعفیٰ دے دیا ہے۔

اب ان کو باورچی خانہ سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا۔ کھانا پکے یا نہ پکے۔ کوئی کھانا کھائے یا نہ کھائے۔ ہانڈی جلے یا رہے، چاہے روٹیاں ٹھکیں یا برتن کتا چاٹے

ان تمام باتوں سے ان کو کوئی مطلب نہ ہوتا تھا اور باورچی خانہ بالکل بواجی حکومت بن کر رہ جاتا تھا اور ایک طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوتا ہے لیکن بوا جعفری خانم کے ساتھ والدہ صاحبہ بھی باورچی خانہ کا مقاطعہ کر دیتی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آخر کار سب کو اس عظیم الشان ہستی اس جلالت مآب وجود اس اہم شخصیت اور اس بلند مرتبہ خاتون کے سامنے جھکنا ہی پڑتا تھا وہ روٹھی روٹھی رہتی تھیں اور سب مناتے تھے وہ پھولی رہتی تھیں اور سب خوشامد کرتے

تھے۔ وہ قہر مجسم ہوتی تھیں اور سب بخشش چاہتے تھے کہ "اے خدا کی برگزیدہ بندی ہم تیرے حضور گناہ گاروں کی حیثیت سے حاضر ہیں۔ اپنے گناہوں کا اقرار ہے۔ اور ہم اپنی خطاؤں کے لیے معافی خواہ ہیں تو اگر چاہے تو ہم کو معاف کر سکتی ہے۔ ورنہ شاید خدا بھی نہ معاف کرے۔"

لیکن وہ التجاؤں پر بھی اپنا منہ بدستور پھلائے رہتی تھیں اور والدہ صاحبہ کے تیور یہ ہوتے تھے کہ "اے میری محترم ملازمہ اگر کسی نے آنکھ دکھائی ہو تو آنکھ نکلوا دوں کسی نے ہاتھ اٹھایا ہو تو ہاتھ کٹوا دوں اور کسی نے زبان درازی کی ہو تو گدی سے زبان کھچوا دوں بہر حال تو خوش ہو جا کہ تیری خوشی میری خوشی ہے اور جو تجھ کو ناخوش کرے۔ وہ میرا دشمن ہے اور جو تجھ کو ستاتا ہے وہ مجھ کو ستاتا ہے۔"

ان صورتوں کے بعد بوا جعفری خانم دو چار دن میں رفتہ رفتہ ٹھیک ہو کر پھر اپنے اسی "ورنٹے" پر آجاتی تھیں اور گھر بھر میں انہیں کا ڈنکا بجنے لگتا۔

افسوس تو یہ ہے کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے اس "جواں مرد" خاتون کو بھی نہ چھوڑا اور ان کے اٹھتے ہی باورچی خانہ کی رونق بھی اٹھ گئی۔ نہ وہ چہل پہل ہے نہ وہ شان و شوکت ہے بس اب صرف باورچی خانہ جہاں اب کھانا پکتا ہے۔ اور جہاں سے دسترخوان برآمد ہوتا ہے بس۔ اب ہم کو باورچی خانہ سے آتنا کام رہ گیا ہے کہ دور ہی سے پوچھ لیتے ہیں۔

پک گیا؛ تو پھر لاؤ۔

پکا چکیں؛ تو اب آؤ۔

وہاں گرمی ہے تو باہر آجاؤ۔

اس کے علاوہ تو اب یاد بھی نہیں آتا کہ یہی باورچی خانہ از منۂ قدیم میں کیا کیا رہ چکا ہے لیکن خدا نہ کرے کہ تاریخ اپنے واقعات کو دہرائے۔

پکچر پیلس

ہمارا شہر سینما کے معزز ناظرین میں اس وقت سے ہے جب سینما محض آنکھوں سے دیکھا جاتا تھا اور کانوں کا وہاں کوئی کام نہ تھا بلکہ سینما کے معاملے میں تو ہمارے کان ایسے تعطل میں پڑے رہتے تھے کہ جب تک ہم فلم دیکھتے رہے۔ ہم کو ان کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی بلکہ چار آنے والوں کے شور سے تنگ آکر بعض اوقات تو ہم بہروں پر رشک کرنے لگتے تھے۔ بہرحال چونکہ ہم سینما کے عشاق میں سے تھے اور اس کا تعلق براہِ راست آنکھوں سے تھا۔ لہٰذا تھوڑے ہی دنوں کے بعد ہم کو چشمے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ فلم بھی صاف دیکھنے لگیں اور فلم دیکھنے کی وجہ سے بینائی میں جو فرق آگیا ہے وہ بھی

دور ہو جائے۔ ہم کو کیا معلوم تھا کہ جن کانوں سے ہم اس قدر تغافل برت رہے ہیں۔ وہی تھوڑے دنوں کے بعد سینما کے معاملہ میں آنکھیں اور کان برابر ضروری ہو جائیں گے اور دونوں میں سے ایک چیز کا بھی نہ ہونا سینما کے لطف سے محروم کر دے گا لیکن سائنس کی ترقی اور مغربی دماغ بھی آئے دن ایسی ایجادیں فرماتے ہی رہتے ہیں جو ہمارے تصور سے بھی بالاتر ہوں۔ چنانچہ لکھنؤ میں ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ فلم بھی آ گئے جو سینما کو گونگے کا خواب معلوم نہیں ہوتے بلکہ پرچھائیوں کو گویائی بخش دیتے ہیں۔ ہم کو بھی ان گویا فلموں کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا اور جب شام کو یہ فلم دکھائی جانے والی تھی۔ ہم نہایت ہی شوق اور اضطراب کے عالم میں پکچر پیلیس پہنچ گئے۔ جہاں ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی بقول اخبار زمیندار انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن تھا۔ بہرحال اسی سمندر میں ایک حباب کی طرح ہم بھی شامل ہو گئے اور تھوڑی دیر تک "آگے بڑھو۔ پیچھے ہٹو" کے بعد بکنگ آفس کی ڈھابلی نما کھڑکی میں ہاتھ ڈال ہی دیا۔ اس کے بعد ٹکٹ لینے میں تو دقت نہیں ہوتی لیکن ٹکٹ لے کر واپس آنا انسان کو فٹبال بنا دیتا ہے۔ بہرحال ہم پر بھی یہی عالم گزرا اور جب ہم اس مجمع سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ بیپ کا تکمہ! شیروانی کے دامن کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اور ٹوپی کا پھندنا یہ تینوں ایک عدد اسی مجمع میں رہ گئے ہیں لیکن اب ان کو ڈھونڈھنے کی کوشش کرنا گویا ازسرنو خطرہ میں پڑنا تھا۔ لہٰذا ہم جان بچا کر ہال میں داخل

ہو گئے اور ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنے حواس ٹھیک کرنے لگے۔ ہال کے اندر ہمارے آنے سے پہلے ہی تقریباً تمام مردم شماری میں شریک ہونے والے جمع ہو چکے تھے لیکن ہمارے پہنچنے کے بعد بھی ہال کے ہر دروازے سے انسانوں کی پیداوار جاری تھی یہاں تک کہ جب ہال کی تمام کرسیاں چار آنے کے درجے سے لے کر تین روپے کے درجے تک بھر گئیں تو ایک ایک کرسی پر دو دو نے بیٹھنا شروع کر دیا لیکن یہ سلسلہ بہت ہی جلد ختم ہو گیا۔ غالباً ٹکٹ بند کر دیئے گئے ہوں گے۔ ورنہ ہمارا خیال تھا کہ تمام لکھنؤ نے آج ہی تماشا دیکھنے کی قسم کھائی ہے۔

اب ہال کے تمام دروازے بند تھے اور تمام ہال بھانت بھانت کے پرندوں چرندوں اور درندوں کے چہچہوں، ملہاروں اور آوازوں سے گونجا ہوا تھا اور مجموعی طور پر جو آواز ہمارے کانوں میں آ رہی تھی، کسی ایسے لشکری زبان کی آواز تھی جو اردو تو اردو ہے پشتو سے بھی زیادہ فصیح معلوم ہوتی تھی حالانکہ ہم اس آواز کو سننے کی کوشش نہیں کر رہے تھے لیکن یہ آواز خود ہمارے کانوں کے پردوں کو پھاڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم کب تک کانوں میں انگلیاں دیئے بیٹھے رہتے جہاں کان کھلے اور "شرغوں غش شوں۔ ٹخ شقاق ہاہا ہا ہر ٹر۔ شوق شرر پنخ پچ لغ تغول غوں غوں غلاک" اور نہیں معلوم کیا کیا آوازیں کانوں کے پردے سے ہوتی ہوئی دماغ

کسے کر اٹھ جاتی تھیں اور تالیاں موسیقیوں کے گویا گھلنے میں تھیں۔ خیر اس تمام کیفیت کے تو ہم عادی تھے اس لیے کہ عمر گزر چکی تھی سینما دیکھتے اور اس لشکری زبان کو سنتے سنتے لیکن جب فلم شروع ہوئی اور ہر طرف سے "خاموش، خاموش" کی آواز شکن آوازوں نے اسٹیج میں گونجنا شروع کر دیا تو ہم سمجھے کہ شاید اب یہ غل کم ہو جائے گا اور واقعی ایسا ہوا کہ سب خاموش ہو گئے۔ البتہ کھانسی کے مرض میں مبتلا یا دمے کے مریض چھینکنے والے تو خیر مجبور ہی تھے بہر حال کم سے کم اتنی خاموشی تو ضرور ہو گئی کہ ہم فلم دیکھنے کے ساتھ سن بھی سکیں۔

یہ ایک ہندوستانی فلم تھی جس کی زبان بھی اردو تھی یعنی چار آنے والے بھی بخوبی سمجھ سکتے تھے بشرطیکہ خاموش بیٹھ کر سنتے لیکن چار آنے والوں کا خاموش رہنا بالکل اسی طرح ناممکن ہے جس طرح کتے کا بھونکنا چھوڑ دینا یا گدھے کا ڈھینچوں سے توبہ کر لینا۔ وہ اپنی غل غش سے بھلا کاہے کو باز رہتے لیکن ہم بھی اس طرح بیٹھے ہوئے سن رہے تھے گویا فلم کی آواز اس تمام شور و غل کے باوجود سیدھی ہمارے کانوں میں آ رہی تھی۔ تماشا ہو رہا تھا اور ہم ہر طرف سے خالی الذہن فلم کے اندر گویا کھوئے ہوئے تھے۔

فرہاد نے جب شیریں کے حسب منشا دودھ کی نہر تیار کر لی اور شیریں نے خود اس کو دیکھ کر فرہاد سے پوچھا کہ بتا کیا مانگتا ہے تو اس نے نہایت بے تکلفی سے یہ کہہ دیا۔

"تمہیں سے تمہیں دلربا مانگتا ہوں۔"

اس مصرعہ کو سمجھنے والے سامعین چار آنے والوں سے زیادہ سخن شناس اور کون ہو سکتے تھے۔ وہ داد دی کہ اسٹیج اڑ گیا اور ہم سوائے دس منٹ ہاہاہاؤں بھاؤں اشی شہ، شرر۔۔۔ ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ کے اور کچھ نہ سن سکے شیریں کے بھی لب جنبان تھے اور فرہاد کا بھی منہ چل رہا تھا لیکن وہ کیا کہہ رہے تھے اس کا ہم کو کچھ علم نہیں۔ ان دونوں کی باتوں کا ہم کو کیا علم ہو سکتا تھا جب کہ اس غل میں ہماری بہت زوردار "آرڈر پلیز" اور "خاموش" بھی خود ہم ہی کو نہیں سنائی دیتی تھی خدا جانے اتنی دیر میں کیا کیا ہوتا رہا کہ ذرا جو غل کم ہوا تو فرہاد صاحب کی تان سنائی دی۔

"میں تو شیریں کا ہوں دیوانہ...... ہاں...... "میں تو شیریں کا ہوں دیوانہ۔"

مگر یہ چونی والوں کی شان کے خلاف تھا کہ وہ ہم کو یہ بھی سننے دیتے اس گانے کو بھی اپنی "ہچی ہچاؤں غرغرفش بھاخ شوں شر" میں لے اڑے اور ہم دانت پیس کر یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ "آرڈر پلیز" "خاموش" کہہ کر رہ گئے۔ تماشا ہوتا رہا اور چونی والے بھی گویا ہماری ضد پر تل کر مچلتے رہے۔ کچھ نہ پوچھیے کہ ہمارے ارمانوں کا کس طرح خون ہو رہا تھا اور ہمارے خون میں کس قدر جوش تھا۔ دل چاہتا تھا کہ ان سب چیخنے والوں کے حلق میں بانس

ٹھونس دیا جائے یا ان سب کو پہلے ٹھنڈا کر دیا جائے۔ اس کے بعد اطمینان سے تماشا دیکھا جائے یعنی ملاحظہ تو فرمائیے کہ یہ کم بخت ہمارے ٹکٹ کے داموں کو ضائع کر رہے تھے۔ ہمارے ارمانوں کا خون کر رہے تھے۔ ہماری دلچسپی کو مٹی میں ملا رہے تھے۔ ہم کو مشتعل کر کے مارے غصہ کے پنجا رہے تھے اور خود نہایت اطمینان سے قہقہوں پر قہقہے، چٹکلوں پر چٹکلے اڑا رہے تھے گویا کوئی بات ہی نہیں ہے۔ سچ بتلائیے کہ اگر اس وقت ہم کو تھوڑی دیر کے لیے مارشل لا کے اختیارات دیئے جاتے تو ہم کیا کرتے۔ خیر اور تو کچھ نہیں لیکن چار آنے والے درجے کو قبرستان نہ بنا دیتے تو ہمارا نام بدل دیا جاتا مگر کیا کرتے مجبور تھے۔ ہم کان صاف کر کر کے سننے کی کوشش کر رہے تھے اور چونی والے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ کہ فلم تو خیر سن ہی نہیں سکتے تھے لیکن خون الگ کھول رہا تھا۔ آخر کار یہ ہوا کہ فرہاد سے کسی نے کوئی بات کہی خدا جانے کیا اس کو اللہ جانے اور چونی والے لیکن ہوا یہ کہ فرہاد گرا اور مر گیا۔ اس پر بھی چونی والوں نے اپنی مشترکہ زبان کا نعرہ لگایا اور ہم غصہ میں اپنی بوٹیاں نوچتے ہوئے ہال سے باہر نکل آئے۔ اور قسم کھائی کہ جب تک چونی والا درجہ نہ اٹھے گا۔ ہم کبھی ٹاکی فلم دیکھنے نہ آئیں گے۔

برقعہ

برقعہ۔ جس کو مستورات کا غلاف یا "عورت پوش" کہنا زیادہ مناسب ہوگا اگر کوئی لباس ہے تو واللہ عجیب و غریب قسم کا لباس ہے بلکہ جو کوئی استعمال کرے وہ بھی عجیب و غریب ہو کر رہ جاتا ہے یہ اور بات ہے کہ ہم اور آپ ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک برقعہ دیکھتے دیکھتے برقعہ دیکھنے اور برقعہ دیکھ کر اس کو عجیب و غریب نہ سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ورنہ یہ واقعہ ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص جو کسی برقعہ پوش ملک کا باشندہ نہ ہو اور جس نے کبھی برقعہ نہ دیکھا ہو اور جس نے ہندوستان میں آکر راستہ گلی میں کسی برقعہ پوش کو دیکھ لے تو جہاں پر ہوگا وہیں رہ جائے گا۔ اس کی نظر میں

برقعہ پوش پر جم جائیں گی اور غور کرنے لگے گا کہ آخر یہ ہے کیا؟ بہت ممکن ہے کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کسی مسخرے نے گاؤ تکیہ کا غلاف اوڑھ لیا ہے۔ یا وہ یہ سمجھے کہ یہ بچوں کو ڈرانے والا "جو جو" ہے یا اس کی سمجھ میں یہ آئے کہ ہندوستان میں انسان بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ بذریعہ پارسل بھیجے جاتے ہیں اور یہ اسی قسم کے پارسلوں میں کا ایک پارسل ہے بلکہ ہمارا خیال ہے کہ اگر اندھیری رات میں کسی سنسان مقام پر اس قسم کے کسی اجنبی کو کوئی برقعہ پوش مل جائے تو وہ سوائے اس کے کچھ سمجھ نہیں سکتا کہ کوئی مردہ مع کفن کے قبر سے نکل بھاگا ہو اور یہ سمجھ کر اس بے چارے کا جو کچھ حال ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ بہر حال وہ برقعہ پوش کو کفن پوش سمجھے یا از قسم بھوت پریت اور آسیب وغیرہ کچھ سمجھے۔ لیکن یہ تو طے ہے کہ وہ یا سر پر پیر رکھ کر بھاگے گا یا بے ہوش ہو کر گر پڑے گا یا چیخنا شروع کر دے گا۔ اس کی یہ حرکتیں ہمارے اور آپ کے نزدیک مضحکہ خیز ضرور ہوں گی۔ لیکن آپ خود غور فرمائیے کہ وہ بیچارہ اگر پہلی مرتبہ برقعہ کو دیکھ کر اس قدر بد حواس ہو جائے تو اس میں اس کی کیا غلطی ہو گی۔ جب کہ برقعہ واقعی ایسا ہی خوفناک ہوتا ہے اور اس کو پہننے کے بعد عورتیں نہ صرف اپنا چہرہ چھپاتی ہیں بلکہ ان پر انسان ہونے کا شبہ بھی بہ مشکل کیا جا سکتا ہے۔

برقعہ کا مقصد تو صرف اسی قدر ہے کہ وہ عورتیں جن سے دنیائے مستور آباد ہے اگر کبھی منظرِ عام پر آئیں تو غیروں کی نگاہیں ان کو نہ دیکھ سکیں بلکہ اس لباس سے ٹکرا کر رہ جائیں جس کو برقعہ کہتے ہیں۔ لیکن ان کو اس کی کیا خبر کہ برقعہ پہن کر وہ مردوں کی نگاہوں سے چھپنے کے بجائے اچھی خاصی تماشا ہو جاتی ہیں اور تماشا بھی ایسا جس کو دیکھنے کا خواہ مخواہ اشتیاق پیدا ہو گویا ان کی حیثیت اس تماشے کی سی ہوتی ہے جو تھیٹر کے ڈراپ سین میں نظروں سے پنہاں رہتا ہے۔ اور ان کا برقعہ تھیٹر کا پردہ رہتا ہے جس کے اٹھ جانے کے بعد تھیٹر کے معزز ناظرین وقت سے قبل ہی مارے اشتیاق کے خدا جانے کتنی سیٹیاں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ عورتیں تو برقعہ پہن کر اس طرف سے بالکل مطمئن ہو جاتی ہیں کہ اب ان کو کوئی دیکھ نہیں سکتا لیکن ان کو اس کی خبر نہیں ہوتی کہ دیکھنے والے ان کا برقعہ دیکھ کر ان کو خدا جانے کس کس شکل و صورت میں دیکھ لیتے ہیں خود ان کا برقعہ ہر شخص کی نظروں کے سامنے برقعہ والی کی ایک ایسی خیالی تصویر پیش کر دیتا ہے جس پر کامل یقین ہو جاتا ہے اور وہ اس خیالی تصویر پیش کر دیتا ہے جس پر کامل یقین ہو جاتا ہے اور وہ اس خیالی تصویر کو دیکھ کر جو سمجھ لیتے ہیں کہ یہی تصویر اس برقعہ میں پنہاں ہے فرض کر لیجئے کہ کوئی بڑی بی برقعہ پہن کر کسی عام راستے سے گزریں تو راہ گیر ان کو کبھی بڑی بی نہ سمجھیں گے بلکہ ان کے ذہن میں ہمیشہ یہی خیال ہو گا کہ اس میں کوئی نوجوان عورت ہو گی جو خوبصورت بھی ضرور ہو گی۔ چنانچہ نہیں معلوم کتنے راہ گیروں کی نگاہیں بغیر ارادی طور

ان برقعہ پوش بڑی بی پر جم جائیں گی کہ کس طرح برقعہ کی نقاب کو جنبش ہو اور وہ صرف ایک ہی مرتبہ اس برقعہ پوش کو دیکھ لیں۔ حالانکہ اگر وہ بڑی بی بغیر برقعہ کے باہر نکلتیں تو کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہ ہوتا بلکہ اگر کسی کی نظر خواہ مخواہ ان پر پڑ بھی جاتی تو منہ پھیر لیتا۔

اس قسم کے مناظر روزانہ ریلوے اسٹیشنوں پر دیکھنے میں آتے ہیں۔ کہ برقعہ پوش خواتین سفر کرتی ہیں اور مسافر ان کی تاک میں رہتے ہیں کہ ان کی صورت کیسی ہے؟ مسافروں کا یہ تجسس کچھ فطری سا ہو کر رہ گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ برقعہ خود ایک سوالیہ نشان ہے اور اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ "بتاؤ تو سہی ہماری صورت کیسی ہے۔" آپ نے دیکھا ہوگا کہ بے پردہ خواتین بھی سفر کرتی ہیں لیکن ان کی طرف متوجہ ہونا لازمی بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ تو بے پردہ ہوتی ہیں۔ ان کی طرف سے اطمینان ہوگا کہ جب دل چاہے گا دیکھ لیں گے لیکن برقعہ دیکھا اور یہ شوق خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کہ اس میں کیا ہے۔ اس کو دیکھنا چاہیئے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ شوق کسی بدنیتی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے یا جو لوگ برقعہ دیکھ کر برقعہ والی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ سب ایک سرے سے بدمعاش بھی ہوتے ہیں بلکہ وہ بے چارے چاہے کتنے ہی شریف اور نجیب الطرفین کیوں نہ ہوں لیکن برقعہ دیکھ کر ان کو خود بخود یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم کو برقعہ پہن کر چیلنج دیا گیا ہے کہ "ہم کو دیکھ لو تو ہم

جائیں۔" اب ان بے چاروں کا یہ حال ہوتا ہے کہ مارے شرافت کے آزادی کے ساتھ تو برقعہ کی طرف نگاہیں اٹھا نہیں سکتے اس لئے کہ یہ بھی شرافت سے بعید ہے۔ البتہ وہ یہ ضرور کرتے ہیں کہ کنکھیوں سے یا نظریں بچا کر برقعہ دیکھ ضرور لیتے ہیں اور اگر وہ اس کی بھی کوشش کریں کہ برقعہ کی طرف نظریں نہ اٹھائیں۔ تو بھی نظریں اٹھ ہی جاتی ہیں اور خواہ کتنی ہی سادگی سے اٹھیں لیکن اس طرح اٹھتی ہیں گویا واقعی مجرمانہ طور پر اٹھ رہی ہیں۔ حالانکہ اگر ایک مرتبہ بھی برقعہ والی ہمت سے کام لے کر برقعہ کی نقاب الٹ دے تو پھر تمام دیکھنے والوں کو اطمینان ہو جائے اور وہ اس طرح مطمئن ہو جائیں گویا ایک بہت ہی اہم سوال خود بخود حل ہو گیا بلکہ ایک بار ان کے سر سے اتر گیا۔ اس کے بعد سے وہ برقعہ والی ان کی ماں بہن کے برابر ہوتی ہے۔

اب یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا نقاب اٹھانے سے پہلے وہ برقعہ والی دیکھنے والوں کی ماں بہن سے کچھ کم ہوتی ہے اور کیا ہر دیکھنے والا بری ہی نظر سے دیکھتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن نگاہوں سے برقعہ والی کو دیکھا جاتا ہے۔ ان کے متعلق قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پاک ہیں یا مجرمانہ۔ اس لیے کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ پاک سے پاک نگاہ بھی برقعہ پوش پر مجرمانہ نگاہوں کی طرح پڑتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیکھنے والا خود یہ سمجھ رہا ہے کہ میں بری بات کر رہا ہوں لیکن برقعہ

کچھ اس کو دیکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ باوجود انتہائی کوشش کے نظر کم بخت پر جا پڑتی ہے۔ عورتیں شاید سمجھتی ہوں گی کہ مرد سب ایک طرف سے شہدے اور بدمعاش ہوتے ہیں کہ جہاں کوئی شریف زادی برقعہ پہن کر نکلی اور تمام مردوں نے تانک جھانک شروع کی۔ عورتوں کا خیال غلط ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مرد ان کو نہیں بلکہ برقعہ کو جاذب نظر چیز سمجھتے ہیں اور برقعہ خود بخود ان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر آپ کسی مرد کو برقعہ پہنا کر باہر نکال دیں تو اس کو بھی دیکھنے والے ان ہی نگاہوں سے دیکھیں گے اور ان کو یہ شوق ہوگا کہ اس برقعہ کے اندر کون پری چہرہ ہے۔

برقعہ کی ایک قسم اور ہوتی ہے۔ اس برقعہ میں جا بجا پیوند ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو اس کثرت سے پیوند ہوتے ہیں کہ یہ سمجھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کہ برقعہ کا اصلی کپڑا کون سا ہے اور پیوند کون سے ہیں۔ یہ برقعہ ان غریب فقیرنیوں کے لیے ایک قسم کا روزی کا ٹھیکرا ہوتا ہے اور اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ پردہ نشین پر رحم کھائیں۔ اس کے متعلق یہ سوچیں کہ خدا جانے غریب پر کیا وقت پڑا ہے۔ اپنے گھر سے نکل کر ہمارے آگے ہاتھ پھیلا رہی ہے۔ لہٰذا اس کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے اور یہی خیرات کی سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اگر اس نے برقعہ نہ پہنا ہوتا تو کیا آپ اس کو اس قدر مستحق سمجھتے جس قدر بے پردہ فقیرنیوں کو سمجھتے ہیں۔

برقعے کی ایک قسم اور ہوتی ہے۔ ایسے برقعہ کی ساخت رہی ہوتی ہے جس کو غلاف یا کفن سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی قسم کے سفید برقعوں کو طرح طرح سے بنایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک نے ٹخنوں تک گاؤن بنا لیا۔ جیسا عام طور پر ہسپتالوں میں کمپاؤنڈر یا آپریشن کرتے وقت ڈاکٹر پہنا کرتے ہیں اور اس کے بعد سر سے لے کر کمر تک دوسرا ٹکڑا بنا لیا۔ بہرحال دونوں مل کر وہی ہو جاتے ہیں جو بغیر اس طوالت کے تھے۔

ایک برقعہ ایسا ہوتا ہے گویا کسی نے اپنے گاؤن کو سر سے پہن لیا ہے یا کسی ایل ایل ڈی نے اپنے گاؤن اور چوکور ٹوپی میں نقاب کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اب گاؤن اور چوکیدار ٹوپی میں نقاب کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اب آج کل تو برقعوں کا یہ فیشن ہے کہ پیشانی کی ہیٹ پر کپڑا منڈھ کر ایک نقاب لگا دی اور اس ہیٹ کو چاروں طرف کمر تک کو چھپا سکنے والا کپڑا سی دیا اس کے بعد شانوں تک کا ایک گاؤن سی لیا اور چیسٹر نما کوٹ بنا لیا اور دونوں کو ملا کر برقعہ بنا لیا۔ اس قسم کے برقعوں کو پہن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیٹر پکس چلا جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ کہاں تک برقعہ کے جملہ اقسام گنائے جائیں۔ یوں تو ایک برقعہ وہ بھی ہے جو ٹریلا نے بمبئی میں پہنا تھا اور ایک برقعہ وہ بھی ہوتا ہے جو ساری پہننے والیاں استعمال کرتی ہیں یعنی ساری باندھ لی اور اس کے اوپر اسی رنگ کا ایک سر سے لے کر کمر تک غلاف سہی لیجیے برقعہ تیار۔

لیکن ان برقعوں کے سلسلے میں جو تکلفات اور اہتمام برتے جاتے ہیں۔ وہ ضرور بیان کیے جائیں گے۔ اس لیے کہ ہم تو برقعہ کا مقصد یہی سمجھتے ہیں کہ عورتیں غیر مردوں کی نظر سے پوشیدہ رہ سکیں لیکن وہ برقعہ ایسا بناتی ہیں کہ خواہ مخواہ اس پر نظریں پڑیں اور برقعہ والی کی خوش سلیقگی، دست کاری، نفاست، خوش مذاقی اور کاریگری کی داد دیں یعنی وہ اپنے برقعہ کو طرح طرح سے جاذبِ نظر بناتی ہیں کہیں تو خوبصورت بیلیں سی بجاتی ہیں۔ کہیں پر نفیس جھالریں لگائی جاتی ہیں کہیں تو خوبصورت ریشمی ڈوریاں ٹنگائی جاتی ہیں۔ اور کہیں کروشیا وغیرہ کے کمالات صرف کیے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ برقعہ بجائے خود ایک حسین چیز بن کر اپنے اصلی مقصد کو فوت کر دیتا ہے اور اچھی خاصی نمائش بن جاتا ہے اور پھر اس پر طرہ یہ کہ اگر مرد دیکھیں تو ان کا قصور۔

یہ سب کچھ سہی لیکن برقعہ کی سب سے زیادہ دلچسپ قسم وہ ہوتی ہے جو برقعہ پہننے والیاں نقاب الٹ کر سر پر رکھ لیتی ہیں اور پھر بھی اپنے کو برقعہ پوش سمجھتی ہوئی بازاروں میں پھرتی ہوئی نظر آتی ہیں یعنی اس برقعہ کی مصیبت کو بھی برداشت کیا خواہ مخواہ یہ لبادہ بھی لادا اور کچھ نہیں۔ جس چہرے کے چھپانے کے لیے سب کچھ کیا گیا تھا۔ وہ بدستور بے نقاب رہتا ہے۔ کوئی ان برقعہ والیوں سے پوچھے کہ نیک بختو تم سے کس نے کہا تھا کہ برقعہ پہنو۔ اگر تم اپنا چہرہ اسی طرح کھلا ہوا رکھ سکتی ہو تو تم پھر اسی عذاب میں کیوں مبتلا ہو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ برقعہ بھی پہنیں گے اور بے پردہ بھی رہیں گے۔ ذرا یہ زبردستی تو دیکھئے اور یہ ضد تو ملاحظہ فرمائیے۔

ان تمام باتوں سے کہیں آپ یہ نتیجہ نہ نکال لیجئے گا کہ یہ خاکسار برقعہ کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہے یا اس کی گھر والی کے پاس برقعہ نہیں ہے جی نہیں۔ اس خاکسار کی اندرون خانہ کے پاس بھی بفضلہ ایک سیاہ رنگ کا برقعہ موجود ہے۔ وہی دو ٹکڑوں والا۔ سر سے لے کر کمر تک کا ایک ٹکڑا اور شانوں سے لے کر ٹخنوں تک کا دوسرا ٹکڑا۔ اور جب وہ اللہ کی بندی ان دونوں ٹکڑوں کو ملا کر پہنتی ہے تو بالکل یہی معلوم ہوتا ہے کہ تصویر کھینچنے کے لیے کیمرہ بالکل تیک ہے۔ ان سے لاکھ لاکھ کہا کہ دیکھو جی اس حرکت سے باز آؤ۔ تم کو اس قطع میں دیکھ کر معصوم بچے دہل جائیں گے لیکن جناب وہاں تو اس کا اثر نہیں ہے جب کہیں گھر سے باہر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ سر سے پیر تک کالی کلکتہ والی بن جاتی ہیں۔

اب بتائیے کہ ہماری یہ تمام بکواس بے کار نہیں تو اور کیا ہے جب حال یہ ہے کہ چراغ تلے اندھیرا ہے اور اندھیرا بھی سیاہ برقعے والا۔ الامان و الحفیظ۔

ہاں

عاشقی میں تو خیر عزت سادات چلی جاتی ہے اور اس طرح کہ گویا بات بھی نہیں لیکن اب معلوم یہ ہوتا ہے کہ مزاح نگاری میں بھی ناک کا جڑ سے صاف ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہ رہے گی اور واقعی جب مزاح نگار اپنی برادری کی عزّت و آبرو کے درپے ہو جائیں گے تو ظاہر ہے کہ مزاح نگاروں کی آبرو ریزی ہوتے ہوتے کیا دیر لگے گی۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے کہ مزاح نگاروں کی برادری کے ایک رکن برادرم مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی المتخلص بہ کول تار کو ماڈل واڑ میں بیٹھے بٹھائے دل لگی سوجھی تو کلکتہ کے ظریف اخبار "چونچ" میں یہ تجویز فرما دی کہ ہندوستان کے تمام مزاح نگار خدا کو حاضر ناظر جان کر اس سوال کا جواب بصورت

مضمون دیں کہ کیا وہ "کبھی پٹے ہیں؟" اور پھر لطف یہ کہ جواب میں بچپن یا طالب العلمی کے زمانہ کی پٹائی سے کوئی بحث نہ کی جائے بلکہ وہ پٹائی ہو جو بچپن اور طالب علمی کے بعد یعنی باعزت اور باحیثیت ہو کر اپنی حماقت یا دوسروں کی زیادتی کی بدولت ہوئی ہو۔ اب بتائیے کہ یہ بات تمام عزت و آبرو پر پانی پھیر دینے والی ہے یا نہیں۔ اگر ہم جھوٹ بول کر بچنا بھی چاہیں کہ بھائی یہ اتفاق کبھی ہم کو پیش نہیں آیا تو اس کے واسطے اس ظالم چغتائی نے پیش بندی کر دی ہے کہ اگر ان حضرات میں سے کسی صاحب نے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ میں کبھی نہیں پٹا تو بخدا مجھے تو یقین آئے گا نہیں ایسی صورت میں سوائے صاف عرض کر دینے کے اور کیا چارہ ہے؟"

الوداع اے عزت و آبرو، الفراق اے خاندان بھر کی ناک اگر آپ ایمان کی بات پوچھتے ہیں تو جی ہاں پٹے ہیں اور ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ بار ہا پٹے ہیں۔ مگر اس طرح کہ ہم نے بھی پیٹا ہے اور اس پیٹنے کے جواب میں۔

ع ۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔

خود بھی مار کھائی ہے، اور مرمت ہم نے بھی کی ہے۔ لیکن چونکہ اس مضمون میں ہم کو اس کا پابند بنایا گیا ہے کہ ہم اپنے پٹنے کی داستانیں بلکہ نوحے عرض کر دیں۔ لہٰذا اپنی شجاعت کے افسانوں کا موقع نہیں۔ ہے تاہم اس مضمون کے

پڑھنے والوں کو اپنی اپنی جگہ پر یہ ضرور سمجھ لینا چاہیئے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلے میں جب لکھنؤ کی فضائیں "گو بیک سائمن گو بیک سائمن" کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھیں اور سیاہ جھنڈیوں سے کمیشن کا استقبال کرنے والوں کے علاوہ بہت سے تماشائیوں کا بھی چارباغ اسٹیشن کے قریب میلہ لگا ہوا تھا ہم کو بھی روزنامہ ہمدم مرحوم کے دفتر سے اٹھا کر اس محشرستان میں بھیج دیا گیا کہ تمام واقعات کی عینی شہادت حاصل کریں اور ہم دفتر سے اٹھ کر تھوڑی ہی دیر کے بعد اس انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے "سمندر" میں ایک قطرہ کی طرح شامل ہو گئے۔ سیاہ جھنڈیوں سے فضائیں "تاریک" ہو رہی تھیں اور "گو بیک" کے نعروں سے زمین و آسمان ہلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ایک طرف تو مجمع کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف پولیس کے لال پگڑی والے پیدل اور سوار مجمع کو آگے بڑھنے کی کوشش سے روکنے بلکہ پیچھے ہٹانے کی جدوجہد میں مصروف نظر آرہے تھے۔ بہر حال مواج سمندر میں ہم بھی تھپیڑے کھا رہے تھے کہ ایک دم سے خدا جانے کمیشن آگیا یا قیامت آگئی لیکن ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ پولیس والے مجمع پر جھپٹے اور مجمع سے بہت سے لوگ ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ اس طوفان کی وجہ دریافت کرنے کا کسے ہوش تھا ہم بھی بلا وجہ سر پر پیر رکھ کر بھاگے مگر بھاگتے کدھر ہر طرف تو انسان ہی انسان تھے جو بھاگنے تک کی جگہ

نہ دیتے تھے۔ بہر حال کسی پر گرے کسی کو اپنے اوپر گرایا اور کسی نہ کسی طرح مجمع سے نکل جانے کی کوشش کرنے لگے اور ایک حد تک بدحواسی کے ساتھ کوشش کرنے لگے لیکن ابھی بدحواسی کے ساتھ کوشش کرنے لگے لیکن ادھر سے پنڈت جواہر لال نہرو ڈٹے رہنے پر زور دے رہے تھے اور بہت سے بھاگنے والے اس نازک وقت میں بھی ان کی آواز سننے کا ہوش رکھتے تھے لیکن ہم نے تو طے کر لیا تھا کہ کوئی بھی کچھ کہے مگر بندہ اب یہاں ٹکنے والا نہیں ہے لیکن جناب قسمت کا لکھا پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔ چنانچہ ہم بھاگ ہی رہے تھے کہ کسی نے ایک ڈنڈا ہمارے رسید کیا جو اتفاق سے اپنے پیروں میں سے ایک پر پڑا اور سچ پوچھیے تو خدا نے بڑا فضل کیا۔ ہم بال بال بچ گئے۔ اب ہم ایک درخت کے قریب پہنچ کر ذرا اپنا پیر سہلا رہے تھے کہ ایک گھوڑے پر سوار لال پگڑی والے نے کچھ ہماری شان میں گستاخانہ الفاظ کہنے کے بعد اس زور سے قلم رسید کیا کہ ہم نے آنکھیں بند کر کے فوراً کلمہ پڑھ لیا اور اپنے شہید ہو جانے کا یقین کر لینے کے بعد مطمئن ہو گئے لیکن آنکھ کھولنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ قلم درخت پر اس طرح سے پڑا تھا کہ ہم صاف بچ گئے تھے لیکن جناب اس حادثہ کے بعد جو ہم بھاگے ہیں تو پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ ہو رہا ہے اور دفتر میں آکر دم لیا۔

غالباً ہمارے پٹنے کا یہ واقعہ تو قومی نقطۂ نظر سے باعثِ شرم ہونے کے بجائے ہمارے لیے باعث فخر ہے بلکہ اگر درخت کے حائل نہ ہو جانے سے وہ قلم

ہم پہ پڑتا تو آج ہم کو بھی وہی درجہ حاصل ہوتا جو لاجپت رائے آنجہانی کو حاصل ہے لیکن اس کے بعد کے واقعات قومی اور غیر قومی ہر نقطۂ نظر سے شرافت پر پانی پھیر دینے والے ہیں مگر مجبوری ہے کیا کیا جائے لہٰذا سنیے اور ہماری نجابت کی داد دیجیے۔

ایک مرتبہ ہمارے ایک دوست سے اس قسم کے معاصرانہ تبادلہ کی نوبت آئی۔ ان کا نام بتانے میں ذرا ہماری توہین ہوتی ہے۔ بہرحال خود واقعہ بھی کچھ کم نہیں ہے اور مطلب تو صرف یہ بیان کرنے سے ہے کہ ہم کیونکر پٹے۔ قصہ اصل میں یہ تھا کہ ہمارے وہ کرم فرما ذرا ذرا سی بات پہ برہم ہو کر بہت سے ایسے واقعات دہرانا شروع کر دیتے تھے جو ہماری دکھتی ہوئی رگ والے واقعات ہوتے تھے لیکن اس بندۂ خدا کو خدا معلوم اس میں کیا کیا لطف آتا تھا کہ لڑائی تو ہوئی آم کے سلسلے میں اور دکھڑا رونا شروع کیا۔ انہوں نے املی کا۔ چنانچہ جس واقعہ کا ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی اسی طرح ہوا کہ وہ اپنے چند دوستوں کے سامنے قابلیت بگھار رہے تھے کہ ہم بھی جا پہنچے اور لگے ان کی قابلیت کا بھانڈا پھوڑنے اس وقت تو خیر وہ اس طرح خاموش رہے کہ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ لیکن جب ان کے دوست اٹھ کر چلے گئے تو انہوں نے اپنی برہمی کا اظہار شروع کر دیا۔ اور ہمارے اس سوال پر کہ "کیوں؟ چپ کیوں ہو؟" وہ

برس پڑے کہ:۔

"میں آپ سے ملنا پسند نہیں کرتا اور اگر آپ کی سنجیدگی کا یہی حال ہے کہ آپ کو آئے گئے لوگوں کا بھی کوئی خیال نہیں تو آپ مہربانی فرما کر مجھ کو معاف رکھیں خود آپ کی تو خیر کوئی پوزیشن ہے ہی نہیں لیکن آپ کو دوسرے کی پوزیشن کا بھی خیال نہیں ہے تو جناب میں باز آیا۔"

اب بتلائیے، ان حضرت نے یہ الفاظ کس قدر مشتعل کرنے والے تھے۔ لیکن چونکہ غلطی خود ہماری تھی۔ لہٰذا ہم نے انتہائی ضبط سے کام لے کر کہا۔

"جناب والا مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ آپ کی طبع نازک کو میرا مذاق اس قدر گراں گزرے گا۔ اگر آپ نہیں ملنا چاہتے تو بسم اللہ۔"

وہ:۔ آپ نے آج ہی یہ کوئی نئی بات نہیں کی ہے بلکہ اب تو یہ آپ کی عادت ہوتی جاتی ہے۔ اور اگر یہی حال ہے تو انشاءاللہ میں کیا کوئی بھی منہ لگانا پسند نہ کرے گا۔

میں:۔ بندہ نواز معاف فرمائیے گا۔ آپ کی طرح کوئی اور خبط دماغ نہیں ہے۔ رہ گئے آپ تو میں نے خود کان پکڑے کہ اب کبھی نہ ملوں گا۔"

وہ:۔ اب آپ کہلواتے ہیں تو سنیے گا کہ آپ کے تمام دوست جن سے ذرا بھی سنجیدگی چھو گئی ہے۔ آپ سے نالاں ہیں اور کوئی آپ سے ملنا پسند نہیں کرتا اور اس لونڈے پن کو کوئی کہاں تک برداشت کرے۔

میں: میرا لونڈا پن آپ کی خر دماغی سے پھر بھی اچھا ہے اور معلوم نہیں آپ کو کس بات پر اتنا ناز ہے۔ اگر کچھ ہوتے تو خدا جانے کیا کرتے کچھ نہ ہونے پر تو یہ حال ہے۔

وہ: میں اس قسم کی بدتمیزی کی گفتگو سننا نہیں چاہتا۔

میں: میں آپ کے ایسے بدتمیزوں سے گفتگو کرنا بھی نہیں چاہتا۔

وہ: آپ اپنی زبان کو روکیے ورنہ اس گستاخی کی سزا کو پہنچیے گا۔

میں: اپنے حواس میں رہو۔ حد سے نہ بڑھو۔ ورنہ یہ تمام اکڑ دھری رہ جائے گی۔

وہ: (گلا پھاڑ کر) خاموش .... بدتمیز کہیں کا۔

ہم: (گلا پھاڑ کر) چپ ... بے ہودہ ... بدتمیز کہیں کا تم خود بدتمیز ....

اس کے بعد پہلے وہ کرسی سے کھڑے ہوئے اور ان کے بعد ہم سب سے پہلے تو بیچ میں رکھا ہوا حقّہ گرا اس کے بعد ہم اور وہ گتھم گتھا ہو گئے۔ ہم کو یہ معلوم تھا کہ ہم کمزور ہیں دبلے پتلے ہیں اور وہ ہاتھ پیر کے اچھے تھے لیکن غصہ اور اشتعال اور غصہ یہ سوچنے کا موقع نہیں دیتا چنانچہ ہم نے میز سے کرسی اور کرسی سے آرام کرسی پر گرانا شروع کیا لیکن ہر مرتبہ گرنے کے بعد اس جوش کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے کہ اب کی یا تو ہم ہی نہیں یا وہ موجود نہیں۔ لیکن سچ ہے کہ کمزوری مار کھانے کی نشانی ہوتی ہے۔ آخر میں انہوں نے ہم کو

مسہری پر گرا کر ایک آدھ ایک گھونسہ رسید کیا کہ ہم کو جوابی گھونسے کا ہوش نہیں رہا اور ہم نے ان کے گھٹنے کے دبے ہوئے سینے سے بمشکل آواز نکال کر کہا۔

"یہ شرافت ہے۔ کمینہ پن، شہدہ پن، بدمعاشی۔"

اور اس کے بعد جب انہوں نے ہم کو چھوڑا تو ہم مقابلہ پر نہیں آئے۔ بلکہ نہایت جوش کے ساتھ تلملاتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل گئے اور اس واقعہ کے دو مہینے بعد تک ہم دونوں آپس میں نہیں ملے لیکن یہ واقعہ آج ہمارے قلم سے نکلا ہے۔ ورنہ اسی دن گھر میں جب سب نے پھٹے ہوئے کپڑے اور چوٹیں دیکھیں اور سبب پوچھا تو ہم نے کہہ دیا تھا کہ ایک پاگل کتا لپٹ گیا تھا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ہم گرے بھی اور اس نے ہمارے کپڑے بھی نوچے لیکن اس کا دانت کہیں نہیں لگا مگر یہ راز کی بات آج ہماری زبان سے نہ سہی بہر حال ہمارے قلم سے نکل رہی ہے۔ اب چاہے ہم کو کوئی ذلیل سمجھے یا کمینہ۔

ایک مرتبہ ریل میں ہماری شامت آئی اور وہ اس طرح کہ ہم غالباً لکھنؤ سے بھوپال جا رہے تھے۔ چنانچہ صبح کے وقت جب لکھنؤ جھانسی ایکسپریس سے اتر کر دہلی بمبئی ایکسپریس پر بیٹھے تو بڑی کش مکش تھی اول تو تیسرے درجے میں ہمیشہ کشمکش ہوتی ہے لیکن اس دن کچھ خلاف معمول کشمکش زیادہ تھی بھی اور مسافر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کے اوپر ایک سوار تھا لیکن ہم کو بہت عمدہ جگہ مل گئی تھی اور ہم بڑے مزے میں سفر کر رہے تھے۔ بینا جنکشن پر گاڑی

کے ٹھہرتے ہی ہماری جو کم بختی آئی تو ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے پلیٹ فارم پر آگئے اور اس وقت تک ٹہلتے رہے جب تک گاڑی نے سیٹی نہیں دی لیکن اب جو ہم گاڑی میں آکر دیکھتے ہیں تو ہماری جگہ پر ایک اور صاحب نہایت اطمینان سے تشریف رکھتے تھے۔ واللہ ان کا اطمینان دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے گویا یہ جگہ ان ہی کی ہے۔ اور ہم زبردستی یا ان کی عنایت سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہم کو دیکھتے ہی نہایت لاپرواہی سے کھڑکی کے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ ہم سمجھے کہ شاید ہوا کھانے کے لیے آ بیٹھے ہیں۔ ابھی اٹھ جائیں گے۔ لہٰذا ہم شرافت سے ان کے اٹھنے کا تقاضا بھی نہیں کیا اور چپ کھڑے رہے لیکن وہ اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے یہاں تک کہ ہم کو کھڑے کھڑے آدھ گھنٹہ ہوگیا۔ جب ہم نے دیکھا کہ ان کا اطمینان بدستور قائم ہے اور جگہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے تو ہم نے ان سے عرض کیا۔

ہم:۔ "اب ہٹیے جناب میں بیٹھوں گا۔"

انہوں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"ادھر بیٹھ جاؤ۔"

ہم:۔ آپ ہی نہ وہاں چلے جائیں میرا تو یہاں سامان وغیرہ رکھا ہے۔

وہ:۔ سامان رکھا ہے تو ہم کیا کریں؟

ہم:۔ ارے بھئی یہ تو میری جگہ ہے۔

وہ:۔ کیا تم نے یہ جگہ خریدی ہے جو تمہاری جگہ ہے۔

ہم:۔ خریدی تو نہیں ہے۔ مگر میں یہاں بیٹھا ہوا تھا۔

وہ:۔ تو اب ہم بیٹھے ہیں تم وہاں بیٹھو۔

ہم:۔ یہ تو اچھی زبردستی ہے۔

وہ:۔ زبردستی کا ہے کی کیا ہم نے ٹکٹ نہیں لیا ہے۔

ہم:۔ یہ کون کہتا ہے کہ تم نے ٹکٹ نہیں لیا ہے مگر دوسرے کی جگہ پر تو نہ بیٹھو۔

وہ:۔ خیر ہم تو نہیں ہٹیں گے۔

ہم:۔ ہٹو گے کیسے نہیں؟

وہ:۔ اچھا دیکھتے ہیں۔ تم ہٹا لیتے ہو۔

ہم:۔ نہیں ہلو گے؟

وہ:۔ نہیں۔

ہم:۔ کیوں آفت مچاؤ گے ہم پھر کہتے ہیں ہٹ جاؤ۔

وہ:۔ کہہ تو دیا ہم نہیں ہٹیں گے۔

ہم:۔ تم نہیں ہٹو گے؟

وہ:۔ ہاں نہیں ہٹیں گے؟

اب ہم کو غصہ آتا آ رہا تھا اور ہم مارے غصہ کے کانپ رہے تھے۔ اس وقت

اگر بس چلتا تو اس بدتمیز کو مارتے مارتے فرش کر دیتے مگر کیا کریں۔ سفر کا معاملہ تھا اور ہم تنہا تھے لیکن چپ ہو رہنا بھی کوئی معنی نہ رکھتا تھا ہم نے پھر کہا۔

"تم نہیں سنو گے؟"

وہ:۔ نہیں... نہیں...

اب ضبط ہمارے سا ختیار میں تھا۔ ہم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا تو اس نے دھکیل دیا اور ہم سامنے والی سیٹ کے مسافروں پر گر پڑے لیکن اٹھ کر ہم نے پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ جھٹکا دے کر کھینچا لیکن اس نے دوسرے ہاتھ سے ہمارے منہ پر تڑ سے وہ چانٹا رسید کہ ہماری آنکھوں کے سامنے

چمکنے سے جگنو کے تھا وہ سماں
ہوا پر اڑیں جیسے چنگاریاں

والا منظر آگیا اور معلوم ہوا کہ جیسے ہم سینما دیکھ رہے تھے اور یہ فلم جل جانے والا اندھیرا اور روشنی تھی لیکن دو ہی سیکنڈ کے بعد ہم پھر اس نامعقول پر جھپٹے اور خدا کی قسم اگر دوسرے مسافر بیچ میں نہ آجاتے تو اس بدمعاش کو مارتے مارتے الو کر دیا ہوتا لیکن ہم کو ہمارے ہم سفروں نے ایسے گھیرا کہ ہم گالیاں تو دیتے رہے لیکن ہاتھ نہ ہلا سکے۔ بہرحال یہ واقعہ بھی خواہ کسی وجہ سے ہو لیکن ہمارے مار کھانے کے واقعات میں سے ایک ہے۔

ان تین واقعات کے بعد باہر کا تو کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں آتا لیکن گھر میں یہ اتفاق ہوئے ہیں۔ مثلاً شادی ہی میں پھولوں کی چھڑیوں سے پٹے تھے لیکن ہم ان واقعات پر روشنی ڈالنا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں۔ وہ تو کہیے برادرم عظیم بیگ صاحب چغتائی کی مروت تھی۔ ورنہ یہی واقعات مرتے دم تک ہماری قلم یا ہماری زبان سے نہ نکلتے۔

علاج بالغناء

لیجیے اور سنئے کہ یورپ کے ایک ڈاکٹر صاحب نے یہ جدید تحقیقات فرمائی ہے کہ اکثر بیماریوں کا علاج گانے کے ذریعے سے ہو سکتا ہے اور بہت سے ایسے امراض ہیں جن میں بجائے دوائیں استعمال کرنے کے یہ طریقہ بے حد مفید ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مستقبل قریب میں لوگ ادویہ کا علاج ترک کر دیں گے۔ اور موسیقی کے ذریعے بیماریوں کا تدارک کریں گے۔ اس طریقہ کو تمام اطبا اختیار کر لیں گے۔ موسیقی سے نہ صرف ذہنی اور دماغی بلکہ جسمانی علاج بھی ہوگا۔

اگر ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق صحیح ہے تو سب سے پہلے ان کو اپنی اور اپنے

ہم پیشہ طبقہ کی خیر منانا چاہیے اور حصول معاش کا کوئی اور ذریعہ تلاش کرنا چاہیے اس لیے کہ موسیقی سے بیماریوں کا علاج عام رواج پانے کے بعد تمام دنیا کے ڈاکٹر اور حکیم تو بس ٹکروں ٹکوں رہ جائیں گے۔ البتہ ان کی جگہ مس زہرہ بائی، مس اللہ رکھی، مس ببن جان، مس ٹمن جان، مس نگن جان، مس بے نظیر مس کگن بائی اور ماسٹر نثار وغیرہ کی خوب پریکٹس چلے گی۔ اور ہر شہر کے بنگلوں میں ہر کمرے میں مطب کھل جائیں گے۔ یہی کم خرچ اور بالا نشین گانے والیاں سول سرجن بھی ہوا کریں گی۔ اور اسسٹنٹ سرجن بھی اور یہی تمام آلاتِ موسیقی آلاتِ طب کا کام دیں گے۔

جب یہ علاج کا طریقہ جاری ہوگا تو غالباً یہ ہوا کرے گا کہ غریب آدمی بیمار ہو کر ڈیوڑھیوں میں اور پاپیادہ گانے والوں اور گانے والیوں کے مکانات اور کمروں پر جایا کریں گے اور وہ مریض دیکھ کر نسخہ تجویز کریں گی کہ اس کو ٹھمری سے فائدہ ہو سکتا ہے یا بھیروں سے۔ غزل اس کے لیے مفید ہوگی یا دادرا اور جیسی بھی مرض کی نوعیت ہوگی ویسا ہی علاج شروع کر دیا جائے گا۔ اسی طرح امراء ان مغنی طبیبوں کو فیس دے کر اپنے گھر پر بلایا کریں گے اور وہ بجائے تھرمامیٹر اور دوسرے آلات کے طبلہ اور سارنگی وغیرہ لے کر موٹر پر نہایت ٹھاٹھ سے ان کے یہاں جایا کریں گے۔ ان کی نبض دیکھیں گے کہ کون سا راگ چھیڑ رہی ہے پھر اسی کے مطابق کوئی تیز تان۔ سنا کر اپنی فیس لیں گے اور کسی

دوسرے مریض کے یہاں چلے جائیں گے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جب یہ طریقۂ علاج رائج ہو جائے گا تو لیڈی ڈاکٹروں کی کثرت ہوگی اور مرد زیادہ تر لیڈی ڈاکٹروں ہی کا علاج کریں گے۔

اگر اس وقت بھی نسخہ لکھنے کا طریقہ رائج رہا تو یہ ہوا کرے گا کہ ڈاکٹرنی صاحبہ مع اپنے سازندوں کے جو اس وقت کمپونڈر کہلائیں گے۔ مریض کے یہاں جائیں گی اور ان کا معائنہ کرنے کے بعد پہلے تو یہ طے کریں گی کہ کون سا مرض ہے۔ یعنی دق ہے یا ہیضہ اور اس کے بعد پھر اس طرح نسخہ لکھیں گی۔

نام مریض ... . چودھری عطاء اللہ شاہ

مرض .... ضعف معدہ

معالج .. .. مس زہرہ بائی گورکھپوری

بار گیو دل پہ برچھی نظر کی۔ گردش کنندہ و عقب آں "جیارا ہلے ہوے ہور۔" سماعت کنند۔

یہ تو ہوا یونانی طریقہ علاج۔ اس طرح انگریزی میں بھی انگریزی نغمات بطور دوا تجویز کیے جائیں گے۔ اب دیکھیے کون سے ولایتی ڈاکٹر صاحب "علاج بالرقص" ایجاد فرماتے ہیں۔

پان

شادی کے معاملہ میں سب سے زیادہ ضروری چیز یہی ہے کہ لڑکے اور لڑکی میں رفتار ذہنی کی یکسانیت ضرور ہو ورنہ شادیاں عام طور پر طلاق ورنہ شادی اور طلاق کے درمیان کوئی درجہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور اس درجہ زن کو شوہر کو اپنی تمام زندگی بسر کرنا پڑتی ہے۔ ہم اس اصول سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ہم نے اپنی متعدد نسبتیں محض اسی وجہ سے نامنظور کر دی گئیں کہ لڑکی یعنی وہ جو ہماری دلہن بنتی ہماری افتاد طبع سے مختلف تھی لیکن آخر کار ہم کو اپنے انتخاب میں کامیابی ہوئی اور ایک ایسی خاتون جو "من تو شدم تو من شدی" کی پوری اہل نظر آئی تھی ہماری رفیقۂ حیات بن گئی۔ یہاں سے ہماری داستان مصیبت کا آغاز

ہوتا ہے اور ہم داستان الم سنانے سے تسلی پا جاتے ہیں کہ اہل دل اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ لیں۔

میں بچار کا عادی تھا وہ بھی بچار کی عادی تھیں۔ میں دن چڑھے سو کر اٹھتا تھا اور اٹھنے کے بعد ان کو اٹھاتا تھا۔ میں مرچ بہت کھاتا تھا۔ وہ اس معاملہ میں میرے بھی کان کاٹتی تھیں۔ مجھ کو ناول پڑھنے کا شوق تھا اور وہ ناول سننے کی عادی تھیں۔ میں نماز سے جان چراتا تھا اور انہوں نے آج تک نماز نہ پڑھی تھی۔ مجھ کو گانے کا ذوق تھا اور وہ گنگناتی تھیں۔ میں خطوط کے جواب دینے میں کاہل تھا۔ اور وہ جواب طلب خطوط آنے کی شدید مخالف تھیں۔ مختصر یہ کہ تمام عادات و خصائل میں وہ تقریباً میں تھیں اور میں تقریباً وہ تھا لیکن پان کے معاملے میں میرے اور ان کے تعلقات بالکل ایسے ہی تھے جیسا مولانا شوکت علی اور گاندھی کے ہو سکتے ہیں۔

میں پان کو غازۂ روئے بہار اور عنوان رنگین لب لعلین یار سمجھتا تھا اور وہ پان کو خدا کی مار کہا کرتی تھیں۔ ان کے دانت ہمیشہ سیپ کے بٹن کی طرح نظر آتے تھے۔ اور میرے منہ کو تو وہ خیر ہمیشہ اگالدان ہی کہا کرتی تھیں۔ مجھ کو ان کا وہ رمضان شریف نما منہ برا معلوم ہوتا تھا اور وہ لال لال منہ سے نفرت کرتی تھیں۔ مجھ کو ان سے اس معاملہ میں خفیف سی شکایت تھی اور ان کو مجھ سے اسی سلسلہ میں کچھ شکوے تھے۔ مختصر یہ کہ پان ہم دونوں کے درمیان حد فاصل تھا۔

مجھ کو شراب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی میں خدانخواستہ افیونی یا چانڈو باز بھی نہیں ہوں میرے پاس سے کبھی چرس یا گانجہ بھی نہیں پکڑا گیا۔ میں نے کبھی باوجود پان کھانے کے کوکین بھی استعمال نہیں کی۔ میں حقہ اور سگریٹ سے لے کر سگار اور بیڑی تک سے بے نیاز ہوں البتہ اتنا قصوروار ضرور ہوں کہ پان کا شدت سے عادی ضرور ہوں۔ اور پان میں صرف اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کے کارخانے کا بنا ہوا تمباکو بھی کھا لیتا ہوں بس میرا یہی جرم ایسا ہے۔ کہ گویا میں افیونی بھی ہوں اور شرابی بھی بھنگڑی بھی ہوں اور چرسیہ بھی اور یقیناً اگر میں ان چیزوں میں سے خدانخواستہ کسی کا عادی ہوتا تو بھی میرے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو پان کھانے کے جرم میں ہوتا ہے۔

حالانکہ ان کو جہیز میں بہت سی کارآمد چیزوں کے علاوہ ایک نہایت خوبصورت پاندان بھی ملا ہے۔ لیکن وہ غالباً یہ سمجھتی ہیں کہ جہاں اور بہت سے الم غلم، چھکڑیا، ٹمٹم چیزیں ملی ہیں۔ وہاں ایک چیز یہ بھی مل گئی ہے کہ ہمیشہ مقفل... الماری کے اندر رکھی رہے۔ رہ گیا اگالدان شاید اس کو وہ یہ سمجھتی ہیں کہ اس میں دودھ کی طرح سفید اور دھنکی ہوئی روئی کی طرح شفاف تھوک تھوکا جا سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ خون کی قے کی طرح پان کی پچکاری سے اس کو ناپاک کیا جائے۔ یا وہ اگالدان سے گلاس وغیرہ کا بھی کام لینا چاہتی ہیں اور اگر سچ پوچھیے تو نہ یہ بات ہے نہ وہ صرف پان سے دشمنی ہے اور کچھ نہیں۔

سب سے پہلے تو جب ان کو یہ علم ہوا کہ میں پان کھانے کے معاملہ میں پن چکی واقع ہوا ہوں تو انہوں نے اپنے عروسانہ سحر سے کام لے کر مجھ کو پان سے توبہ کرنے پر مجبور کرنا چاہا لیکن وہ اس سے بے خبر تھیں کہ جب مجھ کو پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ دلہن کی زینتوں میں پان کی کمی ہے تو میں نے ان کو پان کھلانے کی کوشش کی تھی یہ اور بات ہے کہ نہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئیں نہ میں اپنی کوشش میں۔ لیکن یہ واقعہ بھی ہے کہ دونوں برابر رہے ہیں۔ اس وقت سے آج تک ہم دونوں کے محبت بھرے دلوں میں پان کے معاملے میں ایک ایک خواہش موجود ہے اور اس کا مختلف طریقوں پر اظہار ہوتا رہتا ہے۔ ان کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ باوجود انتہائی مخالفت بلکہ نفرت سے اپنے ہاتھوں سے میرے لیے پان بنائیں لیکن اس کو بھی میرا دل اور میرے کلے ہی خوب جانتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں کا پان کھا کر میرا کیا عالم ہوتا ہے۔ بارہا تو ان کے دست نازپرور کی گلوری نے دو دو اور تین تین فاقے کرائے ہیں کہ منہ کے ٹکڑے اڑ گئے اور ہم کھانے پینے سے معذور ہو کر رہ گئے۔ اس کے علاوہ ہمارے دوستوں کو بھی ذرا کم جرأت ہوتی ہے کہ وہ ہمارے یہاں آ کر پان کھائیں اول تو ان کو پان کے ساتھ بہت سے کوسنے بھی کھانے پڑتے ہیں۔ دوسرے اگر پان کھا بھی لیں تو چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا ہے۔ خیر یہ تمام حالتیں تو قابل برداشت ہیں لیکن ستم تو یہ ہے کہ ہماری گھریلو زندگی میں ایک اجتماع

ضدین موجود ہے اور ہم دونوں میاں بیوی کے درمیان یہ کم بخت پان ایک وسیع خلیج کی طرح حائل ہے۔ مجھ کو اپنی بیوی سے محبت نہیں بلکہ عشق ہے۔ بشرطیکہ وہ میرے پان کے معاملے میں دخل در معقولات نہ کریں۔ اسی طرح میری بیوی کو مجھ سے بے انتہا محبت ہے بشرطیکہ میں پان چھوڑ دوں لیکن نہ "یہ" ہوتا ہے نہ "وہ" اور ایک اندرونی کشمکش جاری ہے۔

بیگم صاحبہ اس قسم کے موقعے ڈھونڈا کرتی ہیں کہ وہ پان کے خلاف احتجاج کر سکیں اور یہاں اس قسم کے موقعوں کی تلاش رہتی ہے کہ ان کو پان کھلا دیا جائے کبھی وہ کامیاب بھی ہو جاتی ہیں اور کبھی ہم لیکن جس دن سے ہمارے سرخ رنگ کی رال ان کی پیازی رنگ کی ساری پر پڑی ہے۔ انہوں نے ہم سے اب پان کبھی نہ کھانے کی ایسی قسم لی ہے جو چوری چھپے تو خیر ٹوٹتی ہی رہتی ہے لیکن علانیہ طور پر ہم سے یہ ناممکن ہے کہ ان کے سامنے پان کھاتے ہوئے چلے جائیں۔ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ہم باہر سے گھر میں جاتے وقت منہ صاف کرنا بھول گئے۔ اور جب بالکل ان کے سامنے پان کھاتے ہوئے چلے جائیں۔ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ہم باہر سے گھر میں جاتے وقت منہ صاف کرنا بھول گئے اور جب بالکل ان کے سامنے پہنچے تو کہنا ہی پڑا کہ اب تو پان کی عادت کچھ ایسی چھوٹی ہے کہ سلیم نے زبردستی پان کھلا دیا۔ مگر پان سے ایک عجیب قسم کی متلی سی محسوس ہو رہی ہے لاؤ ذرا

پانی کلّی کرلوں۔" یہ گڑھنت ان کو دن بھر خوش رکھنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

اور اس قسم کی تصنیفیں چنداں دشوار نہیں ہوتیں لیکن آپ ہی بتلایئے کہ جب وہ ایک دن ہماری جیب سے پانوں کی بھری ہوئی "ڈبیہ" برآمد کرلیں تو ہمارے پاس سوائے خودکشی کے کیا چارہ ہو سکتا ہے مگر واللہ داد دیجیے گا ہماری جسارت کی کہ جیسے ہی انہوں نے ڈبیہ نکالی اور ہم زور سے چیخے۔

"اس کے پان صرف کرنا یہ اسٹیشن جا رہے ہیں۔ تمہارے والد کے پیر صاحب کو دینا ہیں۔ وہ کلکتہ کو جاتے ہوئے ادھر سے گزریں گے۔"

یہاں بھی کامیابی حاصل ہوئی اور بگڑی ہوئی بات بن گئی۔ لیکن واقعات کچھ ایسے بھی ہو جاتے ہیں کہ چوری کھل کر رہتی ہے اور راز افشا ہو ہی جاتا ہے۔ چنانچہ ہم تو دفتر میں پان کھانے کے علاوہ گھر کے مردانے حصے میں بھی آزادی کے ساتھ پان کھاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہاں کس کا ڈر۔ مگر جناب اس حادثہ کو کچھ ہمارا دل ہی خوب جانتا ہے کہ جب ہم نے دو تین گلوریاں ایک ایسے انسان کی طرح جو سات فاقوں سے ہو، بیک وقت منہ میں رکھیں اور ایک دم سے بہت سا تمباکو کھایا۔ ویسے ہی وہ زنانہ مکان کا دروازہ کھول کر کمرے میں موجود۔ اب ہم ہیں کہ نہ نگلا جائے نہ تھوکا جائے اور وہ ہیں کہ جھوٹے کو تا بر خانہ پہنچانے پر تلی ہوئی ہیں اور پوچھتی ہیں۔

"یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟"

ہم: قوں قوں قق قہیں۔

وہ: مجھے گونگوں کی طرح باتیں اچھی نہیں لگتیں۔

ہم: قہنہ، قہنہ، قہنہ

وہ: پھر وہی

ہم: (ڈبیہ نگلنے کی کوشش میں ناکام رہ کر) قق، قق، قق

وہ: وا! معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پان کھا کر بات کر رہا ہو۔

ہم: قہہ، قہہ، قہہ۔

وہ: (ذرا مشکوک ہو کر) اچھا مذاق ختم کرو۔ یہ بتاؤ کہ آج بھی باغ لے چلو گے یا نہیں؟

ہم: قا نہہ، قا نہہ۔

وہ: یہ کیسے منہ میں پان پھنسا ہوا ہے۔

ہم: ....

وہ: اور یہ شاہ صاحب والی ڈبیہ بھی رکھی ہے جو پرسوں آپ کو اسٹیشن پر دینا تھی۔

ہم: ....

وہ: جھوٹ چکا تم سے پان، میں کہتے کہتے مر جاؤں گی۔ تم سے پان نہیں چھوٹ سکتا۔ یہ قسمیں کھائی گئی تھیں۔

یہ کہہ وہ تنتناتی ہوئی گھر میں چلی گئیں اور ہم اب تک یہی سوچ رہے ہیں کہ آخر کیسے نبھے گی؟

عشق کی گولیاں

یہ مضمون مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی کی ایک خاص جدت کا نتیجہ ہے انہوں نے اس کو ناتمام سمجھ کر تمام رسائل میں نقلیں روانہ کیں تاکہ ملک کے دوسرے مزاحیہ نگار اس کو اپنے نقطۂ نظر سے مکمل کریں چنانچہ اس سلسلہ میں جناب شوکت تھانوی کو بھی دعوت دی گئی اور "نگار" میں انہیں کا پورا کیا ہوا مضمون شائع ہوا۔ نیرنگ خیال، عالمگیر، ساقی اور ہمایوں کو بھی اس کی نقلیں روانہ کی گئی تھیں اور غالباً وہاں بھی یہی مضمون دیگر حضرات کے قلم سے شائع ہوا ہے۔ سب سے

آخر میں خود مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بھی اپنے خیال کے مطابق مکمل نمبر دیں گے۔ یقیناً یہ طریقہ مختلف حضرات کے ذوق کے امتحان کا بہت دلچسپ ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کے بعد جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کسی شخص ثالث کو اس فیصلے کا بھی اختیار دیں گے کہ وہ ان تمام مضامین پر تنقید کر کے سب سے بہتر پیوند لگانے کو منتخب کرے۔

(نیاز فتحپوری)

از مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

ناصر کو میں کیا اس کے سارے دوست بے وقوف سمجھتے تھے اور کیوں نہ سمجھتے جس بھلے آدمی کا سر کھوپرے کی بیٹا ہو اس میں عقل ہی کہاں سے آنے لگی اور آئے گی بھی تو کتنی آئے گی۔ بیچارہ چار دفعہ انٹرنس کے امتحان میں بیٹھا اور سب مضمونوں میں فیل ہوا۔ اللہ نے ماں باپ کو روپیہ دیا تھا جھٹ اٹھا ولایت بھیج دیا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ولایت کی کچھ آب و ہوا ہی نئی ہے۔ یا وہاں والے طالب علموں کو کتابیں گھول کر پلا دیتے ہیں کہ یہاں سے اُن پڑھ جاؤ اور تین چار ہی برس میں بی اے۔ ایم اے۔ ایل ایل ڈی ہو کر آجاؤ۔ یہاں ناصر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ یا تو کسی طرح انٹرنس میں پاس ہی نہ ہوتے تھے یا ولایت جاتے ہی زنازن امتحانوں میں پاس ہونے لگے اور تین ہی برس میں بی اے ہو کر ڈاکٹری

کی جماعت میں شریک ہو گئے۔ بڑی نوابی سے وہاں پانچ برس گذارے امتحان میں بیٹھے پاس نہ ہوئے اور سند مل گئی کہ آج سے اس شخص کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے زہر دے کر مار ڈالے جس پر چاہے چھری چلا دے جس کو چاہے عدم آباد پہنچا دے کسی قانون کی رو سے اس کے مقابلے میں ضرب شدید، زہر خورانی یا قتل عمد کا مقدمہ قائم نہ ہو سکے گا۔ خیر پڑھائی سے فارغ ہو کر گھر آئے اور بہت دھوم دھام سے آئے۔ ماں باپ کے دل باغ باغ ہو گئے۔ قبرستان والوں کے ہاں عید ہوئی۔ مریضوں اور بیماروں کی موت آئی۔ میاں ناصر نے اپنی دکان جمائی اور ملک الموت نے ان کے نام سے اپنے دفتر میں ایک کھاتہ کھول دیا۔

[illegible] بچپن کے دوست اور کیسے دوست تھے۔ ہمیں بھی [illegible] شکل [illegible] میں تو کچھ فرق نہ تھا۔ جیسے کالے پیلے تھے ویسے ہی اب بھی تھے۔ ہاں صابن اور کریم کے رگڑوں نے چہرے کو ذرا چمکا دیا تھا۔ مانگ سیدھی [illegible] گئی تھی۔ ترکی ٹوپی کی جگہ ہیٹ نے شیروانی کی کوٹ نے اور پاجامہ کی پتلون نے لی تھی۔ مونچھیں منڈنے سے ذرا مردانہ شکل بھی نکل آئی تھی۔ زبان میں تیزی آگئی تھی لیکن اختصار اور سلیقے کی کمی ان کی گفتگو کو بے معنی سا کر دیتی تھی۔ بات شروع کرتے بڑے لوگوں کے مقولے بیان کرتے اور بہک کر کہیں کے کہیں نکل جاتے۔ ہاں ان کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی کہ جس طرح اکہرے گئے تھے اسی طرح ایک اکن ایک آئے۔ ولایت میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہوں تو چھوڑی ہوں۔

لیکن اپنے ساتھ کوئی دم چھلا لگا کر نہیں آئے۔ خیر یہی غنیمت ہوا ورنہ ان سے تو یہ بھی بعید نہ تھا اور پھر آپ جانتے ہیں کہ ولایتی بیگم صاحبہ اکثر ہم غریب ہندوستانیوں کے ہاں آتی ہیں تو اینٹھی ہوئی آتی ہیں۔ رہتی ہیں تو دوسروں کی ہو کر رہتی ہیں۔ اور جاتی ہیں تو لانے والے صاحب کے سر پہ الٹا استرا پھیر کر جاتی ہیں۔

بھلا میں کیا اور میری بساط کیا۔ ڈیڑھ سو روپیہ کا سی آئی ڈی انسپکٹر اس پر ایک بیوی اور دو بچے وہ ٹھہرے امیرزادے امیر اور ولایت کے تعلیم یافتہ لیکن خدا لگتی کہوں گا کہ وہ بے چارہ جس طرح مجھ سے اور دوسرے دوستوں سے پہلے ملتا تھا اسی طرح بعد میں ملتا رہا معلوم نہیں کہ اس کا باعث اس کی خاندانی شرافت تھی یا یہ وجہ تھی کہ وہ ہم لوگوں کے علاوہ دوسروں کے سامنے بیوقوف بننا نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال کچھ بھی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنے دوستوں کی تعداد میں اضافہ نہیں کیا۔ جب ملتا بہت محبت سے ملتا اور اس طرح ملتا کہ یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ یہ شخص دوسرے ولائتیوں کی طرح ہم غریبوں کا دنیا میں رہنا بے ضرورت سمجھتا ہے۔ یہ سب کچھ تھا مگر مجھے ناصر کی ایک بات سے نفرت تھی۔ وہ ضرورت اور بے ضرورت ہر بات میں خواہ مخواہ دخل دینا اور اپنی رائے ایسے وثوق کے ساتھ بیان کرنا کہ گویا اب اس کی تردید افلاطون ہی کرے تو کرے اور اس کے ساتھ ہی ایسے عجیب و غریب واقعات بیان کر جاتا کہ ان کو اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو "سفید جھوٹ" کہا جا سکتا ہے اور جہاں کہیں ڈاکٹری کی بحث

آجاتی تو پھر کچھ نہ پوچھو، وہ قصے شروع ہو جاتے کہ نہ آنکھوں دیکھے اور نہ کانوں سنے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ڈاکٹری ایک ایسا علم ہے جس کو عقل سے کوئی تعلق نہیں اور ایک ایسا فن ہے جو ولایت گئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اگر اس میں یہ بات نہ ہوتی تو واقعی اس کی صحبت بڑی اچھی صحبت ہوتی لیکن اس کی ان تعلیوں سے طبیعت الجھنے لگتی اور جی چاہتا کہ بس اٹھ بھاگو۔ سب یار دوستوں کو اس سے بس یہی ایک شکایت تھی لیکن صاف صاف کہہ دینے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی۔ سب خاموش بیٹھے اس کی یہ الو پنے کی باتیں سنا کرتے۔ بے تکلف ہو کر اٹھتے اور گھر پہ آکر اس کا مذاق اڑاتے۔

ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اس نے سب دوستوں کی دعوت کی۔ میں بھی گیا۔ کھانے کے بعد پھر اس نے وہی بے معنی باتوں کا سلسلہ چھیڑا۔ کسی نے حکیم شریف خان کے معجون کی تعریف کر دی کہ اعضائے رئیسہ کے لیے اس سے بہتر دوا ملنی مشکل ہے۔ بس پھر کیا تھا ناصر تو بگڑ ہی گیا کہنے لگا کہ "اوہو حکیم بھی اب اس قابل ہو گئے کہ نسخہ ترتیب دے سکیں اور ہندوستان کی سڑیل دوائیں بھی ایسی ہو گئیں کہ اعضائے رئیسہ کو تقویت پہنچائیں۔ یارو! تم کو کیا ہو گیا ہے۔ کہ ایک فن کو جانتے نہیں اور خواہ مخواہ اپنی ٹانگ اڑا دیتے ہو۔ ذرا ولایت جاؤ تب معلوم ہوگا کہ طب کا علم کیا ہے اور علاج کس طرح کرتے ہیں جب میں جرمنی گیا تھا تو ڈاکٹر امرلیکن سے بھی پڑھنا پڑا۔ انہوں نے ایک ایسا عرق ایجاد کیا ہے کہ ایک بوند

روزانہ پلانے سے آٹھ دن میں انسان کی صورت ہی بدل جاتی ہے۔ احسان بیچ میں یوں بول اٹھا کہ "یار عزیز، تم تو بیچ ہی میں اٹھ پڑے گئے تھے ویسے ہی آ گئے۔ ایک آدھ بوند تم بھی پی آتے ہوتے۔"

ناصر نے کہا۔ "آخر میں بول بیٹھا۔ مجھ میں ایسی کون سی کسر ہے، خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے علاج کراتا۔"

احمد سے بھلا کیا چپکا رہا جاتا وہ بولے۔ "مگر یار ڈاکٹر اسٹریس جین تو علاج نہیں کرتے وہ تو معاشیات کے ڈاکٹر ہیں۔"

یہ ناصر کی بے حیائی دیکھیے کہ بجائے قائل ہونے کے الٹا احمد سے پلٹ گیا اور کہنے لگا کہ ماشاء اللہ آپ بھی خوب کہتے ہیں ہم نے چھ مہینے تک ڈاکٹری ہی پڑھی ہے، ڈاکٹری سیکھی۔ تو ہم ہوئے جھوٹے اور آپ ہوئے سچے۔ ذرا سوچ سمجھ کر بولا کرو ورنہ لوگ بے وقوف کہیں گے۔ آج تو یہ کہا ہے کل شاید یہ کہو کہ ڈاکٹر مارگولیتھ کو بھی ڈاکٹری نہیں آتی۔ میرے آنے سے کوئی دو مہینے پہلے کی بات ہے کہ ڈاکٹر مارگولیتھ نے ایسی گولیاں ایجاد کی ہیں کہ تم جیسا بے وقوف شخص بھی چالیس روز تک کھائے تو خاصہ بھلا آدمی ہو جائے۔"

مجید نے ذرا مسکرا کر کہا۔ "ہاں میاں ناصر! یہ تو بتاؤ کہ تم نے بھی ان گولیوں کا استعمال کیا ہے یا جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس آئے۔ یار ہمیں بھی تھوڑی سی منگا دو یا کم سے کم پتہ ہی بتا دو۔ یہ وہی مارگولیتھ ہیں نا جو آکسفورڈ میں پروفیسر

ہی ہیں۔"

ناصر نے کہا کہ "ہاں! یہ وہی ڈاکٹر ہیں۔ جب تم کو پتہ معلوم ہے تو پھر مجھ کو بیچ میں ڈالنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خود ہی کیوں نہیں منگا لیتے مگر یار یہ گولیاں ہیں بہت مہنگی۔"

یاروں میں یہ نوک جھونک ہو رہی تھی۔ میں چپکا بیٹھا سن رہا تھا۔ خبر نہیں کیوں میاں ناصر ایک ہی دفعہ میری طرف مڑ کر کہنے لگے۔

"ارے بھئی تم نے دیکھا یہ لوگ نہ سمجھتے ہیں نہ بوجھتے ہیں خواہ مخواہ دخل در معقولات دینے لگتے ہیں۔ ذرا تم ہی بتاؤ میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں۔"

یقیناً اس لیے کہ ابھی ناصر یہ سن کر پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "مسٹر میاں ناصر کل تک تم اگر ایسی باتیں کہتے۔ ایسی نئی نئی ایجادوں کا ذکر کرتے، تو میں تم کو یقیناً جھوٹا کہتا مگر کل سے میرے ہاتھ میں ایک ایسا مقدمہ آیا ہے کہ تم جو کچھ کہو سب سچ ہے۔ جب ہندوستان والے "عشق کی گولیاں" ایجاد کر سکتے ہیں تو ولایت والے جو کچھ کر دکھائیں وہ کم ہے۔"

"عشق کی گولیاں" یہ نام سن کر سب ہکا بکا رہ گئے۔ میاں ناصر علی بہت کچھ ٹپٹائے آخر کچھ سنبھل کر بولے۔ "ان گولیوں سے عشق کا مرض زائل ہوتا ہے یا پیدا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "پیدا ہوتا ہے۔"

ناصر نے کہا۔ "ہرگز نہیں، دوا [illegible] کو زائل کرتی ہے پیدا نہیں کر سکتی۔ اور پھر عشق کوئی مرض بھی نہیں ہے جو پیدا کیا جا سکے۔"

میں نے کہا کہ دیکھو میاں ناصر تم نے اپنے اتنے چشم دید واقعات بیان کیے۔ میں نے کسی کو غلط نہیں کہا اور نہ یہ کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔ پھر جب میں نا دیکھا ہوا واقعہ بیان کرتا ہوں تو تم کو کوئی حق نہیں ہے کہ اس کو غلط کہو یا جھوٹا سمجھو۔ تم نے جو کچھ کہا وہ صرف زبانی تھا اور میرے پاس تحریری ثبوت موجود ہے۔ یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب سے ایک پاکٹ بک نکالی، دو چار صفحے ادھر ادھر الٹے پلٹے اور کہا دیکھو ان گولیوں کا پورا حال، ان کا اثر اور ان کا تجربہ سب کچھ اس میں لکھا ہے اور ایسے شخص نے لکھا ہے جس نے خود ان گولیوں کو کھایا ہے اور اس وقت شہر کے بڑے اسپتال میں موجود ہے۔ اس کے بعد میں بھی دیکھوں کہ کون ہمت والا ہے جو مجھ کو جھوٹا کہہ سکے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ سارے کے سارے دوست کچھ دم بخود ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک تو سناٹا رہا۔ اس کے بعد ہی سب کے سب میرے پیچھے پڑ گئے کہ بھئی وہ قصہ بیان کرو۔ میں نے بہت کچھ ٹالا مگر یہ شیطانی لشکر کب ماننے والا تھا آخر میں نے کہا کہ دیکھو یار میں واقعہ تو بیان کرتا ہوں لیکن ایک شرط ہے تم کو معلوم ہے کہ میں سی آئی ڈی ہوں، یہ کارروائی بھی راز کی ہے۔ پہلے یہ اقرار کر لو کہ اس کا ایک حرف بھی ہم لوگوں کے باہر نہیں جانے گا اور اگر باہر گیا تو پھر ہماری تمہاری دوستی الفقد۔

خیر بہت کچھ اقرار مدار ہوئے، قسما قسمی ہوئی اور میں نے قصہ یوں بیان کرنا شروع کیا۔ ہاں تو ہوا یہ کہ پرسوں شام کے کوئی ساڑھے چار بجے میں کلب جانے کے لیے کپڑے بدل رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی جا کر سنا تو صاحب تھے کہنے لگے دیکھو ابھی ٹھنڈی سڑک پر جاؤ ایک واقعہ ہو گیا ہے اور امن عامہ میں خلل پڑنے کا امکان ہے۔ کل صبح تک مجھے پوری رپورٹ دی جائے گی۔ جی تو بڑا جلا کہ آج ٹینس گیا۔ مگر کیا کیا جاتا نوکری ہے نہ بھائی بندی ہے اسی وقت الٹے سیدھے کپڑے پہن کر ٹھنڈی سڑک پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ لوگوں کا ہجوم ہے۔ بھاڑ چیر کر اندر چلا وہاں کی جو کیفیت، دیکھی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بیچ سڑک پر نواب عاشق خان پڑے ہیں ایک ہاتھ میں ڈپٹی معشوق علی خان کی لڑکی محبوب بیگم کی ساری کا کونہ ہے اور برابر اونچی آواز میں کہے جاتے ہیں۔ "میں عاشق ہوں میں عاشق ہوں۔ میں عاشق ہوں میں یار تمہارا عاشق ہوں۔"

محبوب بیگم کو تو تم نے بھی دیکھا ہوگا۔ کوئی ۱۷، ۱۸ برس کی لڑکی ہے۔ اسی سال ایف اے کا امتحان پاس کیا ہے۔ باوجود ماں باپ کے منع کرنے کے پردہ اٹھا دیا ہے۔ روزانہ ٹھنڈی سڑک پر میموں کی طرح اینٹھتی پھرتی ہے مگر یار وہ اس وقت جو اس کی حالت تھی وہ دیکھنے کے قابل تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہونٹ خشک تھے۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے بے چاری ساری کا پلو چھڑانے کی کوشش کرتی تھی لیکن

میاں عاشق حسین کچھ ایسے بھوت بن کر چمٹے تھے کہ کسی طرح نہ چھوڑتے تھے۔ مجھے دیکھ کر ذرا اس غریب لڑکی کی جان میں جان آئی۔ میں نے جاتے ہی پہلے تو یہ کیا کہ جھٹکا دے کر اس بے چاری کا پلو چھڑا دیا۔ ارے بھئی چھوٹنا تھا کہ نواب نے ہائے مار ڈالا کا اس زور سے نعرہ مارا کہ میں بھی پریشان ہو گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو نواب بے ہوش پڑا ہے۔ میاں احسان تمہارے چھوٹے ماموں کی موٹر ادھر سے نکلی۔ میں نے موٹر میں نواب کو ڈالا اور شوفر سے کہا کہ ابھی ہسپتال لے جا۔ میں بھی آتا ہوں۔ اس کے بعد تماشائیوں کو ڈانٹا کہ بھائیو تمہیں شرم نہیں آتی۔ کہ ایک غریب لڑکی کا مذاق اڑا رہے ہو۔ جاؤ راستہ لو۔ خیر میرے اس کہنے سے وہ لوگ تو چلے گئے۔ اب میں اور محبوب بیگم وہاں رہ گئے۔ میں نے پوچھا کہ محبوب آخر یہ کیا معاملہ ہے تم کو اتنا بھی خیال نہیں ہوا کہ کورٹ شپ بھی کیا تو بیچ سڑک میں تمہارے باپ اور تمہارے خاندان والوں کو لوگ کیا کہیں گے ایسا ولایتی پن تو شاید یورپ میں بھی نہیں ہوتا۔ میرے اس طرح کہنے سے اس بے چاری کے آنسو نکل آئے کہنے لگی۔

"بھائی پہلے آپ قصہ تو سن لیں۔ اس کے بعد جو جی چاہے کہیں۔ میرا اس میں کیا قصور ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں شام کو چار بجے ٹہلنے نکلا کرتی ہوں۔ کوئی آٹھ دس دن سے یہ ہونے لگا کہ میں ٹھنڈی سڑک کے پاس پہنچی اور نواب عاشق حسین خان آموجود ہوئے۔ میں سڑک کے ایک کنارے پر چلتی ہوں اور

اور وہ دوسرے پر مگر آج تک انہوں نے مجھ سے ایک بات بھی نہیں کی بس ان کا اتنا ہی کام تھا کہ ساری ٹھنڈی سڑک وہ میرے ساتھ ساتھ طے کرتے آپ خود جانتے ہیں کہ یہ میرے والد صاحب قبلہ کے دوست ہیں۔ میں ان کو بچپن سے جانتی ہوں پھر مجھے ان کے اس طرز عمل سے گھبرانے کی کیا وجہ تھی لیکن میں دیکھتی تھی کہ ان کی حالت دن بدن ابتری ہو رہی ہے۔ چلنے میں پاؤں تھرتھراتے ہیں آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں۔ خیر ہوتے ہوتے آج یہ ہوا کہ چلتے چلتے ان کو چکر آ گیا اور لڑکھڑا کر گر پڑے۔ میں ان کی مدد کو دوڑی۔ پاس بیٹھ کر رومال سے ہوا دینی شروع کی۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں میں نے ان کی خیریت پوچھی بجائے اس کے کہ وہ میرا شکریہ ادا کرتے یا مزاج کی کیفیت بیان کرتے انہوں نے میرا شکریہ ادا کرتے یا مزاج کی کیفیت بیان کرتے انہوں نے میرا پلو پکڑ لیا۔ اور عجب نہیں کیا واہی تباہی بکنے لگے۔ تھوڑی دیر میں لوگوں کا ٹھٹھ لگ گیا معلوم معلوم نہیں کہ آپ کو کیسے خبر ہوئی۔ اگر آپ نہ آجاتے تو خدا معلوم میری کیا نوبت ہوتی۔ آخر عورت ذات تھی کہاں تک آپ کو سنبھالتی زار و قطار رونے لگی۔ میں نے بہت کچھ تسلی دی۔ کرائے کی موٹر منگائی۔ محبوب کو اس کے گھر پہنچایا اور خود اسپتال پہنچا۔

یہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ نواب عاشق حسین خان صاحب پلنگ پر لیٹے ہائے ہائے کر رہے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت

کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان کو مرض تو کچھ نہیں ہاں کمزوری ہے اور بہت ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے مل کر میں نواب کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ حضرت یہ بیٹھے بٹھائے آپ نے کیا آفت بپا کی ذرا اپنے کو دیکھو اور اس لونڈیا کو دیکھو۔ ہم بھی تو سنیں کہ آخر یہ ہے کیا بات۔ نواب نے ایک لمبا ٹھنڈا سانس لیا اور کہا کہ کیا بتاؤں "میں عاشق ہوں میں عاشق ہوں یار تمہارا عاشق ہوں۔" جب میں بہت سر ہوا تو انہوں نے یہ پاکٹ بک مجھے دی۔ اور کہا کہ اس میں میرے عشق کی ساری داستان درج ہے۔ اب جاؤ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے پھر وہی اپنی جلیبی جلیبی لے شروع کی کہ "میں عاشق ہوں میں عاشق ہوں میں یار تمہارا عاشق ہوں۔"

گھر آتے آتے رات ہو گئی تھی۔ اس لیے کھانا وانا کھا میں اس پاکٹ بک کو لے کر بیٹھ گیا۔ اب بجائے اس کے کہ میں خود اس قصہ کو بیان کروں اس کے اندراج پڑھ دیتا ہوں۔"

عنوان ملاحظہ ہو۔

عاشق حسین خان کے عشق کی داستان

یوں تو اللہ کا دیا میرے یہاں سب کچھ موجود ہے لیکن وہ چیز جس کے لیے انسان پیدا ہوا ہے یعنی عشق اس سے میں اب تک نا آشنا رہا۔ عشق مجازی کی بھی کوشش کی لیکن تھوڑے دنوں میں طبیعت اکتا گئی۔ عشق حقیقی

کے لیے بھی بہت کچھ نمازیں پڑھیں وظیفے گھونٹے مگر کورے کا کورا رہا۔ آخر پریشان ہو کر اس کو بھی چھوڑ دیا۔ اس وقت میری عمر پچاس سے کچھ اوپر اور ساٹھ سے کچھ کم ہے۔ رہ رہ کر خیال آتا کہ میاں عاشق حسین جیسا تمہارا نامۂ اعمال سیاہ ہے وہ تو تم بھی جانتے ہو۔ عبادت میں دل نہیں لگتا کم سے کم کسی نہ کسی طرح عشق مجازی ہی کی تکمیل کر لو کیوں کہ یہی عشق حقیقی کا زینہ ہے۔ مگر کیا کیا جائے ہزار کوشش کرتا کسی صورت سے عشق مجازی کی طرف بھی طبیعت راغب نہیں ہوتی تھی۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ آخر یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ رسالہ ندرت کے خاص نمبر میں حکیم مشکل کشا کا اشتہار دیکھا۔ انہوں نے منطقی دلائل سے یہ ثابت کر کے کہ عشق ایسی چیز نہیں جو خود بخود پیدا ہو۔ اپنی گولیوں کا اشتہار دیا تھا اور دعویٰ کیا تھا کہ اگر ان گولیوں کے کھانے سے پریشان خیال آدمی بھی عاشق نہ ہو جائے تو وہ ہر طرح کا ہرجانہ بھرنے کو تیار ہیں۔ اشتہار کی تحریر ایسی معقول کہ اس کی صداقت پر کسی طرح شبہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اشتہار کی نقل کیے دیتا ہوں تاکہ آپ بھی ملاحظہ فرما لیں کہ میری رائے غلط ہے یا صحیح۔

عشق کی گولیاں

حکماء کا قول ہے کہ عشق بھی ایک مرض ہے۔

از شوکت تھانوی . . . . جو

عام امراض کی طرح بغیر مادے کے پیدا نہیں ہوتا اور بغیر اخراج

مادّہ کے دفع نہیں ہوتا۔ انسان میں فطرتاً عشق کا مادّہ موجود ہے جس کا ہیجان میں آجانا انسان کو قیس اور فرہاد کا درجہ دے دیتا ہے۔ ورنہ انسان اپنے مقصدِ زندگی سے بے خبر رہ کر جس طرح دنیا میں آتا ہے اسی طرح دنیا سے چلا جاتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر عشق کا وہ مادّہ ہیجان میں نہ آئے۔ تو انسان کو اندر ہی اندر نہ معلوم کن کن امراض میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ان ہی تمام باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر سالہا سال کی تحقیق اور تفتیش کے بعد رفاہ عام کے لیے ہم نے ایسی گولیاں ایجاد کی ہیں جن کے استعمال سے پتھر کی طرح بے حس انسان بھی عاشق بن سکتا ہے اور عشق کا منجمد سے منجمد مادّہ بھی ہیجان میں آسکتا ہے۔ ان گولیوں کے متعلق صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ ان کے اجزا میں سے ایک جز اتفاق سے قیس نے کھا لیا تھا جو مجنوں بن گیا اور ایک فرہاد نے کھایا تھا جو کوہ کن کے نام سے زندۂ جاوید ہے آج ہی آرڈر دیجیے ورنہ تازہ گولیاں بننے تک انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑے گی۔ قیمت فی پیکٹ جس میں مکمل خوراک دس گولیاں ہوں گی۔ اور پرچہ ترکیب استعمال بھی ہمراہ ہوگا ۱۰ روپے محصول ڈاک

بذمہ خریدار۔ فائدہ نہ ہو تو قیمت کے ہمراہ پچاس روپے بطور جرمانہ واپس ذیل کے پتے پر آرڈر دیجیے۔

حکیم مشکل کشا خان، عمدۃ الحکما، مالک مشکل کشا میڈیکل ہال بارود خانہ اسٹریٹ لاہور۔

اس اشتہار کو دیکھ کر میرے دل نے گواہی دی کہ یہ اشتہار منجانب اللہ صرف میرے لیے دیا گیا ہے۔ ۔ حکیم مشکل کشا خان کو خداوندِ کریم نے صرف میری مشکل کشائی کے لیے پیدا کیا ہے۔ میں نے بارہا اشتہار کا مضمون پڑھا اور ہر مرتبہ میرے دل پر اس کی صداقت کا اثر قائم ہوتا گیا یہاں تک کہ میں نے ایک کارڈ اٹھا کر لکھ ہی دیا۔

مکرمی جناب حکیم صاحب۔ تسلیم۔ آپ کا اشتہار رسالہ ندرت میں نظر سے گذرا۔ براہِ کرم اپنی عشق کی گولیاں ایک پیکٹ مندرجہ ذیل پتہ پر وی پی فرما دیجیے۔ تشکر گزار ہوں گا۔

نیاز مند
عاشق حسین خان
عاشق منزل نمبر ۵ م۔ الف نگر
پریم گنج

خط لکھ چکنے اور سپرد ڈاک کرنے کے بعد ہی مجھ کو اپنے میں ایک ایسی تازگ

اور ایسی محسوس ہونے لگی گویا کسی بہت بڑے مرض سے سبکدوش ہوگیا ہوں بلکہ بعض اوقات تو میں اپنے میں کچھ اس قسم کی گرمی محسوس کرتا تھا کہ گویا محض گولیوں کا آرڈر دینے سے عشق پیدا ہوگیا ہے۔ سات آٹھ روز تک میرا یہی عالم رہا اور اس دوران اپنی کیفیت کا خود ہی اندازہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ عشق تو خیر نہیں عشق کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ معلوم نہیں ظالم نے کون سا عمل پڑھ کر اشتہار لکھا تھا کہ اس کے الفاظ تک میں بھی عشق کی گولیوں کی تاثیر تھی۔ بہرحال خدا خدا کرکے عین انتظار کے عالم میں ایک دن پوسٹ مین نے دس روپے کا وی پی دیا۔ ہم تو خود ہی ہر وقت وی پی کا دام ازاربند میں باندھے پھرتے تھے فوراً قیمت ادا کرکے وی پی وصول کر لیا اور نہایت اضطراب کے ساتھ پیکٹ کھول کر پہلے تو گولیوں کی صورت دیکھی جو بالکل بکری کے بچوں کے مینگنیوں کے برابر تھیں اور رنگ میں بھی ان سے ملتی جلتی لیکن معلوم ہو رہا تھا کہ گویا ہر گولی کے اندر ایک دنیائے عشق آباد ہے اور گولی کیوپڈ کے کمان کا تیر نہیں بلکہ کیوپڈ کے ریوالور کا کارتوس ہے۔ ہم نے دس گولیوں کو بغور دیکھنے کے بعد ترکیب استعمال کا پرچہ کھولا جو تھا تو ایک ہی ورق لیکن دونوں طرف چھپا ہوا۔ ایک طرف تو تقریباً یہی مضمون تھا جو اشتہار کی صورت میں ہم دیکھ چکے تھے اور دوسری طرف ترکیب استعمال درج تھی جو من و عن درج ہے۔

اگر تم عاشق بننا چاہتے ہو تو آج ہی طے کر لو کہ تم عاشق ہو اور دل میں اس

کا پورا یقین کر لو کہ تم کو عشق ہے۔ اس کے بعد سہ پہر کو غروب آفتاب سے کچھ قبل غسل کر لو۔ آنکھوں میں سرمہ لگاؤ۔ صاف کپڑے پہن کر عطر لگاؤ۔ سر میں خوشبودار تیل ڈال کر تھوڑا سا پانی میں ملا لو کنگھی سے بال سنوارو اور یہ طے کر کے کہ تم اپنے محبوب کے پاس جا رہے ہو۔ بسم اللہ کہہ کر گھر سے نکلو لیکن گھر سے نکلتے وقت ایک تولہ سرد پانی کے ہمراہ ایک گولی کھا لو اور پھر خوشبودار پان کھا کر کسی پر فضا مقام پر یہ طے کیے ہوئے چلے جاؤ کہ وہاں تم کو تمہارا محبوب ملے گا۔ چنانچہ جس مرد یا عورت کو دیکھ کر تمہارے دل میں پسندیدگی کا جذبہ سب سے پہلے پیدا ہو اس کو تم اپنا محبوب سمجھنا اسی سے تم کو عشق ہوگا اور دس دن کے اندر ہی اندر عشق اپنے مدارج طے کرے گا لیکن دس تک چاہیئے کہ اپنے محبوب کا تعاقب ضرور کرو اور اگر بہت زیادہ دشواریاں ہوں تو کم سے کم ایک مرتبہ۔ ضرور دیکھ لو اگر تم ان ترکیبوں پر عمل کر کے دس دن تک دس گولیاں ایک گولی روزانہ کھائیں تو تمہارے عاشق ہونے کی ذمہ داری مجھ پر ہے ورنہ ہم ذمہ دار نہیں۔

اگر اپنے محبوب کی مطیع بنانا چاہتے ہو تو اس عمل کو یاد کر لو۔ "میں عاشق ہوں میں عاشق ہوں یار میں تمہارا عاشق ہوں۔"

اور جب تم اپنے عشق کے ہاتھوں بالکل ہی بے قابو ہو جاؤ اور یہ سمجھ لو کہ اب بغیر وصل یار کے زندگی محال ہے تو اسی عمل کو اپنے محبوب کے سامنے اس طرح پڑھو کہ وہ بخوبی اس کو سن سکے بلکہ اگر بار بار سنے تو زیادہ اچھا ہے۔

میں نے ترکیب استعمال کو بار بار پڑھا تاکہ خوب اچھی طرح سمجھ جاؤں اور خوب سمجھ گیا تو اس کو عملی صورت میں لانے کے لیے اہتمام شروع کر دیے۔ غروب آفتاب میں تو ابھی بہت دیر تھی لیکن میں نے اس دیر کو غسل وغیرہ کے کسی اہتمام میں کسی نہ کسی طرح کاٹ دیا اور آخر کار حسب ہدایت غروب آفتاب سے قبل نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر عطر سے معطر ہو کر اور کنگھی چوٹی سے فارغ ہو کر دل میں یہ طے کر کے کہ محبوب کے پاس جا رہے ہیں۔ گھر سے اس طرح نکلے کہ ؎

کوچۂ یار میں اس ٹھاٹھ سے جاتا ہوں میں
شور ہر سمت اٹھا مار چلا مار چلا

گھر اتفاق سے واقع ہوا ہے چوراہے پر جہاں سے چار سڑکیں مختلف مقامات کو جاتی ہیں۔ ایک بوچڑ خانہ کو، دوسری جیل کو، تیسری دریا کے کنارے اور چوتھی سول لائنس کو۔ ہم نے سوچا کہ اگر کسی بوچڑ خانہ کی طرف گئے تو کسی قصائی زادی سے عشق ہونا لازمی ہے اگر جیل کی طرف گئے معشوق جرائم

پیشہ ملے گا۔ دریا کے کنارے زیادہ سے زیادہ دھوبی یا ملاح کے خاندان سے عشق کا رشتہ جوڑنا پڑے گا۔ لہٰذا سب سے بہتر یہی ہے کہ ٹھنڈی سڑک سے مڑتے ہوئے سول لائنس کی طرف جائیں۔ بہت ممکن ہے کہ قسمت میں کوئی مغربی بت طناز لکھا ہو۔ لہٰذا بسم اللہ کہہ کر اسی طرف کو چل کھڑے ہوئے راستہ میں قدم قدم پر راہ گیر ملتے تھے اور ہم ہر ایک کو اس لیے دیکھ لیتے تھے کہ ممکن ہے ان ہی میں کوئی ہمارا مطلوب ہو لیکن دل میں پسندیدگی کا جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا آخر چلتے چلتے جب ہم ٹھنڈی سڑک سے سول لائنس کی طرف مڑنے ہی والے تھے کہ دور سے آسمانی رنگ کی ریشمی ساری ہوا میں لہراتی ہوئی نظر آئی اور اس ساری میں لپٹی ہوئی خاتون ہماری ہی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں سمجھا کہ شاید کنواں خود پیاسے کے پاس آ رہا ہے۔ ایک دم سے چلتے چلتے ٹھہر گیا۔ وہ خاتون ایک خوبصورت کشتی کی طرح اپنے بادبان اڑاتی ہوئی مجھ سے قریب تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اب میں نے اس کی صورت دیکھ کر یہ غور کرنا شروع کر دیا کہ میں نے اس کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ صورت پہچانی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی لیکن دماغ پر لاکھ لاکھ زور دینے کے بعد بھی مجھ کو یاد نہ آیا کہ میں نے اس کو کہاں دیکھا ہے۔ یہاں تک کہ وہ میرے نزدیک سے گزری اور مجھ کو سلام بھی کیا۔ سلام کا جواب تو خیر میں نے غیر ارادی طور پر دے دیا۔ لیکن اب مجھ کو اور بھی یقین ہو گیا۔ کہ یہ صورت دیکھی بھالی ہے۔ میرا دماغ اسی غور و فکر میں تھا۔ میری نظریں اس پر

جمی ہوئی تھیں اور دل اسی طرف کھنچا ہوا معلوم ہوتا تھا میں اس کے ایک ایک انداز کو اس طرح دیکھ رہا تھا گویا وہ کوئی ایسی چیز ہے جس کو میں نے اب تک نہیں دیکھا اس کی چال میں کافی پامالیاں تھیں وہ کبھی مجھ کو ایک مست طاؤس نظر آتی تھی اور کبھی حسین ہرنی وہ اپنی ساری کو ہوا کی تیزی سے اڑنے نہ دینے کی کوشش میں کبھی تو کامیاب ہو جاتی اور کبھی ناکام ہو کر عجیب منظر پیش کرتی تھی ہرن کھری کا سفید جوتا اس کے نازک جسم کو اس طرح اٹھائے ہوئے تھا کہ وہ سڑک پر اس رنگین حباب کی طرح تیرتی نظر آتی تھی جو موجوں کی زد میں بہا جا رہا ہو میں تھوڑی دیر تک اس دلکش منظر کو دیکھتا رہا پھر غیر ارادی طور پر اس کے پیچھے ہو لیا تمام راستے میں اسی کو دیکھتا رہا لیکن جب وہ ایک کوٹھی کے احاطے میں نار پھاند کر داخل ہو گئی تو مجھ کو بھی یاد آیا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور وقت زیادہ آ چکا تھا لہٰذا میں بھی گھر آ گیا اور جب بستر پر لیٹا تو سوائے اس سوال کے کوئی بات ہی نہ تھی کہ میرا محبوب کون تھا؟ دل نے کہا۔ وہی خاتون۔ لیکن میں نے کہا استغفراللہ، میرا اس کا کون سا جوڑ۔ وہ ٹانگ برابر کی چھوکری اور میں پنشن لینے کے قریب۔ لیکن اس کے علاوہ میرے دل و دماغ میں کسی کا خیال ہی نہ تھا۔ تب اسی غور و فکر میں بستر پر پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا کہ طبیعت مالش کرنے لگی اور باوجود الائچی اور پان وغیرہ کھانے کے ایسی زبردست قے ہوئی کہ سینے کی ایک ایک آنت کھنچ کر رہ گئی۔ میں

سمجھا کہ مکھی کھا گیا ہوں لیکن یاد آیا کہ کھانا بھی تو نہیں کھایا ہے پھر سوچا کہ کالرا ہو گیا ہوگا مگر پیشاب کیا تو خوب کھل کر ہو گیا۔ پھر ہم کو خود ہی یاد آ گیا کہ لاحول ولا قوۃ نہ مکھی کھائی ہے نہ کالرا ہوا ہے۔ یہ سب علامتیں عشق کے لاحقے کے ہیجان میں آنے کی ہیں۔ گولیوں کے تیر بہدف اور زود اثر ہونے پر اعتقاد سا ہو گیا اور ہم قے آ جانے کے بعد والی خستگی سے نڈھال ہو کر سو گئے۔ صبح کو طبیعت صاف تھی مگر کمزوری بدستور محسوس ہو رہی تھی جس کی وجہ ظاہر تھی کہ رات کو ایک تو کھانا نہیں کھایا اس پر قے ہو گئی حالانکہ اس وقت بھی کھانا دیکھ کر متلی آ رہی تھی لیکن زبردستی ایک آدھ لقمہ کھا کر آنے والی شام کے انتظار میں بیٹھ گئے اور آفتاب کی رفتار کا اندازہ کرتے رہے کبھی غسل کا پانی ٹب میں کرتے تھے اور کبھی کپڑے نکال کر رکھتے تھے کبھی عطر کی شیشی اٹھا کر آئینے کے سامنے رکھ دیتے تھے اور کبھی تیل کی بوتل کے قریب تھوڑا سا پانی، اس طرح خدا خدا کر کے پہاڑ سا دن کاٹا اور شام کو اس طرح گھر سے گولی کی طرح نکلے اور ٹھنڈی سڑک پر پہنچے۔ آج پھر وہ بیگم صاحبہ اسی انداز میں ملیں۔ ان کی عمارت گری میں سوائے اس کے کوئی فرق نہ تھا کہ سوائے آسمانی کے کاسنی رنگ کی ساری میں تھیں۔ میں نے لاکھ ان کی طرف سے نظریں ہٹانے کی کوشش کی لیکن جب سامنے سے گزرتے ہوئے انہوں نے ادب سے تسلیم کی تو مجھ کو بھی آنکھیں چار کر کے جواب دینا پڑا اور اس کے

بعد میں پھر اسی غور و فکر میں محو ہو گیا کہ یہ ہیں کون؟ اور میں نے ان کو یا انہوں نے مجھ کو کہاں دیکھا ہے؟ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ہم اسی غور و فکر میں آج پھر انہیں کے ساتھ ہو لیے۔ ع۔

جن سے کچھ جان نہ پہچان بڑی مشکل ہے

اور کل کی طرح آج بھی سڑک کے ایک سرے پر وہ اور ایک سرے پر ہم چلتے رہے یہاں تک کہ وہ تار پھاند کر کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو گئیں اور ہم غریب خانے پر واپس آ گئے۔ آج بھی بھوک نہ تھی۔ طبیعت میں گرانی محسوس ہو رہی تھی لیکن میں اس طرف سے بے فکر رہنے لگا تھا۔ کیا واقعی یہی صاحبزادی میری محبوبہ ہیں؟ دل کو یقین نہ آتا تھا لیکن واقعات یقین دلا رہے تھے۔ آخر کار میں نے بھی کہا اگر مشیت یزدی یہی ہے تو کیا چارہ۔ ظاہر ہے کہ عشق کا دیوتا اندھا ہے۔ وہ کچھ نہیں دیکھتا کہ کس کا دامن کس کے ہاتھ میں دے رہا ہے۔ اس کو صرف دل کا خیال ہوتا ہے۔ نہ دنیا کے کسی اونچ نیچ کا وہ تو بس آنکھ بند کر کے تیر چلا دیتا ہے۔ اب اس کی [illegible] کے پیچھے لگے۔ آج پھر طبیعت مالش کرنے لگی اور بجائے ایک کے دو مرتبہ قے ہوئی بلکہ تھوڑی دیر کے بعد دست بھی آیا لیکن مجھ کو کوئی تشویش نہ تھی بلکہ میں عشق کے مادے کے ہیجان میں آنے سے خوش تھا۔ تیسرے دن بھی سب کچھ وہی ہوا جو پہلے دوسرے دن ہوا تھا۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ اول تو میں نے اس خاتون کو

بجائے صاحبزادی کے براہِ راست اپنی محبوبہ سمجھ کر دیکھا اور ان کے سلام کا جواب بھی مسکرا کر دیا۔ دوسرے مجھ کو قے بھی دو مرتبہ ہوئی اور پاخانے بھی دو مرتبہ گیا۔ اب میرا روزانہ کا یہ معمول ہو گیا کہ شام کو گولی کھا کر ٹھنڈی سڑک جانا وہاں سے اپنی محبوبہ کے ہمراہ سڑک کو درمیان چھوڑ کر ان ہی کے متوازی چل کر ان کو کوٹھی کے احاطے کے تاروں تک پہنچانا وہاں سے گھر لوٹ کر آنا دو ایک مرتبہ قے کرنا اور دو ایک مرتبہ پاخانے جانا اور پھر نڈھال ہو کر سو رہنا لیکن روز بروز میں اپنے میں ایک کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ غذا تقریباً بالکل چھوٹ گئی تھی۔ رنگ زرد ہو کر رہ گیا تھا، ہاتھ پیروں میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ دوست احباب مریض بتلاتے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ عشق کا مادہ ہیجان پہ ہے اور میں عاشق بن رہا ہوں۔ اس لیے مجھ کو کوئی فکر نہ تھی۔ میری محبوبہ میرے دل و دماغ بلکہ تمام جسم میں سما چکی تھی اور مجھ کو اب بغیر اس کے زندگی دشوار نظر آتی تھی۔ بارہا ارادہ کیا کہ اب اس کے مطلع کرنے والا عمل پڑھوں لیکن دل نے کہا اب ایسی بھی کیا جلدی ذرا مادے کو اور ہیجان میں آنے دو لیکن آٹھویں دن تو میرا برا حال تھا۔ اول تو کمزوری کی وجہ سے مجھ کو امید نہ تھی کہ کل پھر آ سکوں گا۔ دوسرے اب صبر کی تاب نہ تھی۔ مشکل تمام ضبط کیا اور طے کر لیا کہ کل عمل ضرور پڑھ کر اپنی قسمت کا فیصلہ کر لوں گا۔"

میں نے عاشق حسین خان کے عشق کی داستان سن کر کہا نویں دن جو

کچھ ہوا وہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ اب بتایئے کہ ان گولیوں کو کس طرح جھٹلایا جا سکتا ہے۔ سب کے سب اپنی جگہ پر نقش حیرت بنے بیٹھے تھے۔ قصے کے سچ ہونے کے لیے تحریری ثبوت موجود تھا اور گولیوں کے تیر بہدف ہونے کا ثبوت یہ قصہ تھا لیکن ناصر بھلا کب ماننے والے تھے تھوڑی دیر تک "انگشت حیرت در دہاں نیمے دروں نیمے ہودں" کے بعد فرمایا۔ اگر کوئی گولی بچی ہو تو مجھ کو فوراً منگا دو میں اس کے اجزائے ترکیبی کو علیحدہ علیحدہ کر کے مشتہر صاحب کو بڑے گھر کی سیر کرا دوں گا۔ مذاق نہیں ہے اس قسم کی دوائیں بنا لیں۔ بدمعاش کہیں کے یہ لوگ ٹھگ ہیں ڈاکو۔

میں نے کہا "اس میں بڑے گھر کی سیر کرانے کی کون سی بات ہے کیا صرف اس لیے کہ ایک ہندوستانی نے ایک ایسی چیز تیار کر لی جو یورپ میں ہونا چاہیئے تھی۔"

ناصر نے قابلیت کے ساتھ ہم کو سبق پڑھانے کے انداز میں کہا۔ "بھائی تم لوگ طب نہیں جانتے تم کو کیا بتاؤں۔ تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اصل غضب یہ ہے کہ ان گولیوں میں زہریلی چیزیں بھی ہیں جو عشق مجازی تو خیر مجازی ہے انسان کو خدا سے بھی واصل کر سکتی ہیں۔"

احمد نے طالبانہ انداز سے کہا "لیکن زہر کا یہ فعل تو ہرگز نہیں ہے کہ عشق پیدا کر دے اور اگر زہر سے عشق ہو گیا تو خواہ وہ زہر ہو یا کچھ بہرحال

حکیم مشکل کشا خاں کا مقصد پورا ہو گیا۔

ناصر نے اس کو بے وقوف سمجھ کر جواب دیا۔ "آپ ہیں صاحبزادے عزیز من! ان گولیوں میں دماغ کو ماؤف کرتے معدے کو خراب کرنے جگر کو تباہ کرنے اور دل کو کمزور کرنے کے ایسے ایسے زہر ہیں جو اچھے خاصے آدمی کو جان سے مار کر چھوڑیں۔ غریب عاشق حسین خان کا دماغ اس حد تک بیکار کیا کہ وہ اپنے دوست کی لڑکی کو بھی نہ پہچانا۔ افسوس یہ حکیم مشکل کشا خاں نے طبابت کی ہے یا موت کے فرشتے کے فرائض انجام دیئے ہیں۔"

احسان کی شامت آئی تو کہا۔ "ان زہروں سے دماغ کے خراب ہونے کے بعد سہی مگر عشق ہی کیوں ہوا اور کچھ ہو جاتا۔"

ناصر نے اونہہ کہہ کر اس کی طرف سے رخ بدل لیا اور مجھ سے کہا حضرت آپ مجھ کو وہ گولی دیجیے پھر دیکھیے تماشا۔ حرام زادے، بے ایمان، دغاباز مکار.....

اب گویا مجھ کو اس مقدمے کی تفتیش بھی کرنا تھی اور عشق کی گولیاں بھی حاصل کر کے ناصر کو پہنچانا تھی۔ لیکن ناصر کے یہاں سے اٹھ کر جب شیطانی لشکر دور نکل گیا تو سب نے ایک زبردست قہقہہ لگایا کہ خوب گدھا بنایا۔ مگر طے پایا کہ کل ایک بکری کی مینگنی ان لقمان وقت کو دی جائے گی۔ دیکھیے اس میں کون سے زہر نکالتے ہیں اور کیا قابلیت بگھارتے ہیں۔

بہن ہمسائی

نہ ہم ان کے کوئی تھے اور نہ دنیا میں کوئی ان کا ہمدرد تھا۔ بس جو کچھ بھی تھیں۔ بہن ہمسائی تھیں۔ وہی ان کی ہمدرد وہی ان کی مونس، وہی ان کی غمگسار اور وہی ان کی دکھ درد کی شریک۔ بس یوں ہی سمجھ لیجیے کہ کچھ دنوں تک تو تعلقات کے ان بڑھتے ہوئے پینگوں کو ہم بیگم صاحبہ کی وہی حماقت سمجھتے رہے جو عام طور پر عورتوں میں پائی جاتی ہے لیکن ہم کو اطمینان تھا کہ عورتیں اس قسم کے تعلقات کو نباہنے میں کبھی وضعداری سے کام نہیں لیتی ہیں اور اس طرح بیگم صاحبہ اور ان کی بہن ہمسائی میں بھی آج ہی کل میں تو تو میں میں ہو کر اس تمام بہناپے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن جب ہمارے انتظار کی کوئی حد ہی نہ رہی اور

ہم نے یہ دیکھا کہ دوستی تو بجائے گھٹنے کے روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے تو ہم کو بھی بہن ہمسائی سے خواہ مخواہ رقابت پیدا ہو گئی اور ہم ان سے باقاعدہ طور پر جلنے لگے لیکن ہم اپنی رقابت اور جلن کو ظاہر کرنا بھی مصلحت وقت کے خلاف سمجھتے تھے لیکن موقع موقع سے ہمسائی کی جڑ کاٹنے میں مصروف تھے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ آخر اس میں ہمارے جلنے کی کون سی بات تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ جلنے کی جو کچھ بات تھی اس کو ہم ہی سمجھ سکتے ہیں اور ہمارا دل ہی خوب جانتا ہے۔ اب یہ بتلائیے کہ ہم تو دفتر سے مرے کھپے خستہ نڈھال اس امید پر گھر آئے کہ بیگم کا ہنستا ہوا منہ دیکھ کر بشاش ہو جائیں گے۔ تمام کلفت دور ہو جائے گی وہ گرمجوشی سے ہمارا خیر مقدم کریں گی اور ہم ان کی گرمجوشی کی داد محبت سے دیں گے۔ وہ ہم کو منہ دھونے کے لیے پانی دیں گے اور ہم منہ دھو کر تازہ ہو جائیں گے۔ وہ ہمارے لیے چائے منگائیں گی اور ہم ان کو بھی اپنے ساتھ چائے پلائیں گے لیکن گھر پر جب پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہڑتال ہے۔ تمام گھر میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ پوچھا ملازمہ سے۔ "ارے کہاں ہیں بیگم؟"

جواب ملا "حضور بہن ہمسائی کے یہاں گئی ہیں۔" بس جناب کچھ نہ پوچھیے کہ اس وقت کیا کیفیت ہوئی۔ معلوم یہ ہوا کہ ایک چنگاری پیروں سے اٹھی اور سر پر آ کر بجھی۔ طبیعت یکایک ایسی نڈھال ہو گئی کہ گویا تھوڑی ہی دیر کے مہمان ہیں۔ دل سے اک آہ کے ساتھ بددعا نکلی کہ اے خدا یا تو بہن ہمسائی کو

کراٹھلائے یا ہم ہی کو موت دے دے اور پھر مری ہوئی آواز میں ملازمہ سے کہا، "ذرا منہ دھونے کو پانی دو اور چائے لاؤ" جب ہم منہ دھو کر چائے زہر مار کر چکے تو کھڑکی کھلی اور آپ اس طرح تشریف لائیں گویا کوئی بات ہی نہیں ہے۔ "ارے آپ آ گئے۔" جی میں آیا کہ جواب دے دیں کہ جی ہاں آ بھی گئے اور مر بھی چکے مگر ہم نے ضبط کر کے بیواؤں کے انداز سے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "جی ہاں۔"

ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم پر بیوی کی پوری محبت طاری تھی اور وہ بھی ہم کو واقعی خوش رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہر بات ہماری مرضی کے مطابق ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہمسائی کا بھی ذکر نہ تھا اور اس طرف سے ہم خالی الذہن تھے۔ مختصر یہ کہ ہماری وہ بادشاہوں والی کیفیت ہو گئی کہ بیوی سے کہہ دیں کہ "جو مانگنا ہو مانگ" "بتا کیا مانگتا ہے۔" لیکن پھر ہم نے بجائے ان سے کچھ کہنے کے خود ہی کہا۔ "ارے بیگم تمہارا سوئٹر کس قدر میلا ہو گیا ہے اور تم نے دھلوایا بھی نہیں" خلاف عادت کہنے لگیں "نہیں تو، ابھی تو ایسا میلا نہیں ہے۔" ہم نے اصرار کے ساتھ کہا "نہیں میلا ہو گیا ہے۔ اب دوسرا آئے گا۔" بولیں "ابھی کیا کیجئے گا لا کر پھر دیکھی جائے گا۔" ہم نے بڑے آدمیوں کی طرح جواب دیا۔ "نہیں نہیں آپ میرے ہوتے ہوئے میلا سوئٹر نہیں پہن سکتیں۔" کہنے لگیں "اچھا آپ کی خوشی۔" اور ہم سہ پہر کو بازار پہنچ گئے کہ اپنی بیگم کے لیے بہتر سے بہتر اور قیمتی سے قیمتی سوئٹر لائیں گے۔ تمام ہندوستانی اور انگریزی دکانیں چھان ماریں اور ہر جگہ سینکڑوں قسم

کے سوئٹر کوٹ دیکھنے کے بعد ایک کا انتخاب کر کے خرید لیا۔ جس کے متعلق ہماری رائے یہ تھی کہ شہر لکھنؤ میں شاید ہی کسی رئیس زادی کے پاس نکلے۔ ہم کو یقین تھا کہ اس سوئٹر کوٹ کو دیکھ کر بیگم کی باچھیں کھل جائیں گی اور آج سے وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے ہماری ممنون ہو جائیں گی اور واقعی وہ چیز بھی ویسی ہی تھی۔ کمبخت اگر لیڈیز سوئٹر کوٹ نہ ہوتا تو کبھی کبھی ہم بھی بیگم سے مانگ کر پہن لیا کرتے۔ لیکن ہمارے لیے یہی کیا کم ہے کہ "مسز ہماری" "یہ سوئٹر کوٹ پہنیں گی اور ہم دیکھ کر خوش ہوں گے۔ جس محفل میں پہن کر جائیں گی۔ ہمارا نام ہوگا کہ فلاں صاحب کی بیگم ہیں۔ ہم ان ہی خوشگوار خیالات میں مستغرق گھر پہنچے اور زوردار آواز سے کہا "بیگم آؤ تو دیکھو تو سہی کہ میں بھی تمہارے لیے کیا چیز لے آیا ہوں۔" بیگم اٹھلاتی ہوئی آئیں اور ہمارے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ہم نے بکس کھول کر کہا۔ دیکھا تم نے۔ پھر نہ کہنا کہ ہمارا میاں ہم کو نہیں چاہتا۔ سوئٹر کوٹ کے حسن سے مرعوب ہو کر بیگم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اہا ہا ہا۔ مگر کتنے کا ہے؟" ہم نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ تم کو اس سے کیا مطلب کتنے ہی کا ہو تم مزے سے اس کو پہنو۔" مچلنے کے انداز سے اصرار کر کے کہنے لگیں "نہیں بتا دیجئے کہ کتنے کا ہے؟"

ہم نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ تم کو اس سے کیا مطلب کتنے ہی کا ہو تم مزے سے اس کو پہنو۔" مچلنے کے انداز سے اصرار کر کے کہنے لگیں "نہیں بتا دیجئے کہ کتنے کا ہے؟"

ہم نے کہا "پھر وہی آخر تم قیمت معلوم کر کے کیا کرو گی۔ تم اس کو جتنے کا

دل چاہو سمجھ لو۔" تجربہ کارانہ انداز سے سوئیٹر پر ہاتھ پھیر کر بولیں: "کوئی بارہ تیرہ روپے کا ہے نا؟" ہم نے ان کی بے وقوفی پر ہنس کر کہا: "لاحول ولا قوۃ خیر اتنا ہی کا سہی۔" کہنے لگیں: "اللہ اگر بتا دیجئے گا تو کون سا نقصان ہو جائے گا۔" ہم نے مجبور ہو کر لاپرواہی سے کہا: "پچپن روپے آٹھ آنے کا ہے۔" ایک دم سے منہ کھول کر رہ گئیں: "پچ ... پن ... روپے ... کا ہے؟" ہم نے کہا: "تو کون سی بات ہوئی تم اس کو ابھی میرے سامنے پہن لو۔" اس پر سے ڈر کر اس طرح ہاتھ اٹھا لیا گویا کاٹ کھائے گا اور کہنے لگیں۔ "نا بابا، میں اس قدر مہنگا نہ پہنوں گی۔ روپیہ فالتو نہیں ہے۔" ہم نے ذرا برا مان جانے کے انداز سے کہا۔ "اچھا نہ پہنئے لائیے واپس کر دیں۔" خوشامد کے ساتھ کہنے لگیں۔ "اچھا تو اب سچ بتا دیجئے کہ کتنے کا ہے؟" ہم نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا "پچپن روپے آٹھ آنے کا ہے مگر نہ تو یہ واپس ہوگا اور نہ آپ اس کو اٹھا کر رکھ سکیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کو پہننا شروع کر دیں ورنہ مجھے سخت رنج ہوگا جب انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ فیصلہ قطعی ہے تو کہنے لگیں۔ "اچھا تو لائیے ذرا بہن ہمسائی کو دکھا دوں۔" ان کا یہ کہنا تھا کہ معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے دل پر ایک گھونسہ مارا مگر ہم نے انتہائی ضبط سے کام لے کر کہا۔ "اچھا دکھا دیجئے۔" اور وہ زناٹے کے ساتھ کھڑکی کھول کر ہمارے رقیب کے یہاں پہنچ گئیں اس کے بعد جو کچھ ہوا واللہ اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ یعنی وہاں سے ہنستی ہوئی آئیں اور کہنے

"بڑے وہ ہیں آپ بھی۔" ہم نے حیرت سے کہا "کیا؟" کہنے لگیں "یہ کہہ دیا پچپن روپے آٹھ آنے کا ہے۔" ہم نے کہا "اور؟" کہنے لگیں۔ "اور بہن ہمسائی کہتی ہیں کہ ان کی بھاوج کے دیور اپنی بیوی کے لیے ایسا ہی سوئٹر کوٹ پار سال چھ روپے چار آنے کا لائے تھے اور وہ ایسا کمزور تھا کہ دو ہی دن میں تار تار ہو گیا تو میں کیا کروں گی ایسا لے کر۔" ہم نے ضبط کرنے کی کوشش کیے بغیر کہہ دیا "بہن ہمسائی کے باپ کی بھاوج کے دیور کی بیوی کو بھی ایسا سوئٹر کوٹ نصیب ہوا ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ اگر کوئی اسکافر روئیں دار کھال امیں روپے میں لائے تو غلامی کا خط لکھتا ہوں؟" انہوں نے ہمارے اس غصہ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو بدل دیجیے۔" انہوں نے دھوکا کھایا ہوگا۔ ہم نے کہا۔ "جی نہیں بس اب یہ واپس کر دیا جائے گا اور یہ کہہ کر ہم کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتے ہوئے تیر کی طرح گھر سے باہر نکلے اور بازار سے دکان پہنچ کر سوئٹر کوٹ واپس کر دیا۔ وہاں سے گھر آ کر پچپن روپے بیگم صاحبہ کے ہاتھ میں رکھے اور کہا۔ کہ تم ہمسائی کی بھاوج کے دیور سے منگا لو میں اب نہ لاؤں گا۔ بیگم تو خیر اس واقعہ سے متاثر نہ تھیں لیکن ہمارا یہ حال تھا کہ گویا ایک بنا بنایا قلعہ ڈھا کر بیٹھے ہیں اور صنم یعنی اس ہمسائی نے ہم کو پسپا کر دیا ہے۔ اب سچ بتائیے کہ ہمسائی کے متعلق ہماری کیا رائے ہو سکتی تھی اور ہمارا ہمسائی سے جلنا کہاں تک حق بجانب تھا۔

کہاں تک ہمسائی کے کرم بے پایاں کا ذکر کیا جائے لیکن اس خیال سے کہ کوئی ہماری زیادتی نہ سمجھے ہم ایک واقعہ اور عرض کرنا چاہتے ہیں کہ نصیب دشمناں برخوردار نورِ چشم سلسلہ کی طبیعت خراب تھی اور ماں کے برابر نہ سہی لیکن پھر بھی چونکہ ہم باپ ہیں، ہم کو بھی سخت فکر تھی ....

لیکن کرتے تو کیا کرتے بس یہی کر سکتے تھے کہ یونانی علاج کیا جب اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو ڈاکٹری علاج شروع کر دیا اس کو بھی چھوڑا تو ہومیوپیتھک دوا دینے لگے لیکن کسی علاج سے کوئی فائدہ ہی نہ ہوتا تھا اور ہمارا رات رات بھر حکیموں اور ڈاکٹروں کے گھروں کے سو سو چکر لگانے میں وقت گزرنے لگا لیکن اس کے باوجود بیگم صاحبہ کے یہ تیور تھے کہ گویا ہم نے ان کے بچے کو بیمار ڈالا ہے۔ اور اب ہم ہی اس کی طرف سے لاپروائی برت رہے ہیں۔ وہ زبان سے تو خیر کچھ نہ کہتی تھیں لیکن آنکھوں آنکھوں میں کھائے جاتی تھیں۔ بہرحال ہم کو اس کی تو پرواہ بھی نہیں البتہ ہم کو یہ ضرور برا معلوم ہوتا تھا کہ ایک تو بچہ کی علالت کی فکر اس فکر اس پر سے بیگم صاحبہ کی قہرمانیت پھر بھی ہم نے کبھی اس سلسلہ میں بیگم سے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ اس لیے کہ ہم ان کو بھڑ کا چھتہ سمجھنے لگے تھے اور اسی میں بات بڑھ رہی تھی، ورنہ صفائی ہو جاتی تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ وہ تو کہیے کہ ایک دن ہم نے ان سے کہا کہ آج سول سرجن کو لاتا ہوں۔ اس کا جواب انہوں نے اپنے اسی بھولے پن سے دیا "نہ لائیے گا۔"

ہم نے پوچھا۔ "کیوں؟" کہنے لگیں "یوں ہی" ہم نے کہا "صاف صاف کہو۔" بولیں "کہہ تو دیا" اب ہم عجیب شش و پنج میں تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ تھوڑی دیر ہم نے اس بحث ہی کو ٹال دیا لیکن باوجود انتہائی غور و فکر کے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ سول سرجن کو دکھانا ضروری ہے تو ہم نے پھر سنبھلتے ہوئے بیگم سے کہا۔ "آپ سول سرجن کو لانے کے لیے کیوں منع کر رہی ہیں؟" انہوں نے پھر وہی مہمل جواب دیا "یوں ہی" ہم نے اس جواب پر عاجز آکر پہلے تو ارادہ کیا کہ سر پیٹ لیں پھر سوچا کہ بھاگ جائیں۔ پھر خیال آیا کہ کپڑے نوچ ڈالیں۔ آخر ہم نے گڑگڑا کر کہا۔ "اے بیگم خدا کے لیے رسول کے واسطے صاف صاف کہو تم کیا کہہ رہی ہو ورنہ میرا دماغ الٹ جائے گا۔" اب انہوں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا جو کچھ دل میں ہے کہہ ڈالیں گی پھر چاہے جو کچھ بھی ہو چنانچہ کہنے لگیں۔ "آپ کو خود معلوم ہے کہ میں سول سرجن کو لانے کے لیے کیوں منع کر رہی ہوں۔ آپ کو اگر اس کی ذرا بھی پرواہ تھی اور اس کا ایسا ہی خیال تھا تو پہلے ہی کیوں نہ وہ پتی ڈھونڈ لا کر شفا لی ہوتی نہ آج یہ نوبت آتی۔" ہم نے کہا "کون سی پتی؟" کہنے لگیں "آپ نے تو حشت کر دیا اور سب ٹھہرے پاگل۔ ابھی آج ہی بہن ہمسائی اس کو دیکھنے آئی تھی اور کہہ رہی تھیں کہ اس معصوم کو جان بوجھ کر مارا جا رہا ہے۔ اس کو کسی علاج سے فائدہ ہی نہیں ہو سکتا۔ چاہے سول سرجن کا علاج ہو یا کسی افلاطون کے بچے کا ہاں اگر اب بھی وہ پتی آ جائے تو چٹکی بجاتے

ہوئے پسینہ کی خرخراہٹ اور پسلی کا چلنا اب بند ہو سکتا ہے۔ واللہ دل تو یہ چاہا کہ ابھی پستول کے لائسنس کے لیے درخواست دے دیں اور اس ہمسائی کو ٹھنڈا کر کے پھانسی پر چڑھ جائیں لیکن کیا کرتے مجبور تھے کہ بچہ بیمار پڑا تھا۔ اس وقت ہنگامہ برپا کرنا مناسب نہ تھا لہٰذا خاموشی کے ساتھ دانت پیستے ہوئے باہر چلے گئے اور ان لقمان کی صاحبزادی ہمسائی کی بتائی ہوئی بتی لانے کے لیے نوکر کو بھیج دیا۔ اس بتی نے جو اثر دکھایا ہے ظاہر ہے کہ ہم کو آخر کار سول سرجن کو بلانا پڑا۔ وہ تو کہیے کہ بچہ کی زندگی تھی بچ گیا۔ ورنہ طے تھا کہ اس ڈائن ہمسائی کو جہنم ہی واصل کر کے چھوڑتے۔

یہی وہ واقعات ہیں جنہوں نے ہماری بیوی کی بہن ہمسائی کو ہمارے لیے عذاب کا فرشتہ بنا دیا ہے کہ جہاں ان کا نام آیا اور ہم اندر ہی اندر ایک خاموش آگ میں جلنے لگے لیکن اب تو یہ حال ہے کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ لیکن ہم نے وہ ترکیب نکالی ہے کہ یاد کریں گی۔ بیگم صاحبہ اور ان کی ہمسائی دونوں۔ وہ ترکیب یہ ہے کہ مکان دار کو اس پر راضی کر لیا گیا ہے کہ وہ ہم پر اس کھڑکی کو بند کرنے کا نوٹس دبا ڈالے اور اس کی وجہ یہ بتائے کہ اس مکان کے مکان دار سے اور خود اس سے جنگ ہو گئی ہے۔ لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ وہ کھڑکی کو چنوا دے۔ ظاہر ہے کہ اس بات کو بیگم صاحبہ آسانی کے ساتھ قبول نہ کریں گی اور ہم کو بھی ان کی وجہ سے مکان دار کے اس مطالبہ سے اختلاف کرنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں ہم نے مکان دار کو خوب اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ کہ میرے بھائی تم نہایت سخت الفاظ کے ساتھ نوٹس دینا کہ مکان پندرہ دن کے اندر خالی کر دو۔ اول تو مکان خالی نہ ہوگا اور اگر ہم کو مکان خالی بھی کرنا پڑا تو تمہارے مکان میں اپنے سے پانچ روپیہ زیادہ دینے والا کرایہ دار دلوا دیں گے۔

اب دعا فرمائیے کہ یہ کوشش کامیاب ہو اور اسی طرح ان بہن ہمسائی صاحبہ سے نجات حاصل ہو۔ اس طرف سے اطمینان رکھیے کہ اب جو ہم نے مکان تلاش کیا ہے اس کے چاروں طرف کوئی مکان نہیں ہے لہٰذا جدید بہن ہمسائی کے پیدا ہونے کا امکان نہیں ہے لگے ہاتھ یہ بھی سن لیجیے کہ اگر خدانخواستہ ہماری یہ آخری کوشش ناکام ہوئی تو یہ بھی طے ہے کہ یا تو ہماری موت بہن ہمسائی کے ہاتھوں آئے گی۔ یا بہن ہمسائی کی موت ہمارے ہاتھوں۔ اب ہم اور ہماری بیوی کی بہن ہمسائی دونوں اس دنیا میں نہیں رہ سکتے۔ یا تو وہی رہ سکیں گی اور یا ہم ہی رہیں گے۔

بسم اللہ اللہ اکبر

چوہیا کو دم پکڑ کر قیمہ کی مشین میں ڈال دیا۔ اور سینڈل گھما کر نہایت نفیس کبابوں کا قیمہ تیار کر لیا۔ لیکن یہ اس وقت کا ذکر ہے جب ہم معلم الملکوت کے استاد معظم تھے اور ہماری ہر شرارت کو ہمارے بزرگ بچپن کہا کرتے تھے۔ اس کے بعد سے تو یہ حال ہوا کہ جس قدر عمر بڑھتی گئی بزدلی میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے واسطے کسی ختنہ کی تقریب میں شرکت یا لڑکیوں کے کان چھیدنے کا نظارہ بھی قیامت ہو گیا اور رفتہ رفتہ ہم اس قوم کے فرد بن گئے جو تیغوں کے سائے میں پل کر جوان ہوتا ہے لیکن بندوق بلا لائسنس نہیں رکھ سکتا۔ شکار ہم نے کبھی نہیں کھیلا۔ مرغ یا کسی پرند کو ذبح کرنے کا ہم

کو کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ علم جراحی سے ہم کو کبھی دلچسپی نہیں ہوئی پھر بھلا ہم سے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ بقر عید کے دن ہم اپنے ہاتھوں سے بکرا ذبح کرتے لیکن بات کچھ ایسی آپڑی تھی کہ اگر ذبح نہیں کرتے تھے تو مردانگی میں فرق آیا جاتا تھا اور ذبح کرتے تو کیسے کرتے جب کہ اس خیال سے بھی پسینہ آجاتا تھا عجیب شش و پنج میں پڑے ہوئے تھے کہ بیگم نے کہا۔

ایسا بھی کیا کوئی مرد ہے جو ایک معمولی سا بکرا ذبح نہ کر سکے۔ ہم نے تن کر جواب دیا۔

"اجی بکرا؟ بکرے کی حقیقت ہی کیا ہے؟ مجھ سے کہئے تو ہاتھی ذبح کر دوں؟"

منہ چڑھا کر کہنے لگیں۔

"جی ہاں بجا ہے۔ ہاتھی ذبح کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

اب آپ ہی بتایئے کہ تمسخر کے بعد ہم کو کس قدر اشتعال پیدا ہو سکتا تھا۔ واللہ دل تو یہ چاہا کہ اسی وقت ایک چھری اٹھا کر ہم تمام دنیا کے بکروں اور بکریوں کو ذبح کر کے ڈال دیں۔ لیکن ہم نے ضبط سے کام لیا۔ اس لیے کہ اگر مشتعل ہو جاتے تو بیگم کی وکیلوں والی چال کامیاب ہو جاتی۔ ہم نے بیگم کی تمام طعن و تشنیع کا خندہ پیشانی سے جواب دیا اور اس غیر دلچسپ بحث کو ٹال کر وہاں سے ٹل گئے۔ ابھی وقت بھی کافی تھا۔ اس معرکے کے لیے پوری رات پڑی تھی لیکن

بیگم صاحبہ یہ چاہتی تھیں کہ کل کی قربانی کے لیے آج ہی ہم سے وعدہ لے لیں تاکہ گذشتہ کی طرح عین موقع پر ہم فرار نہ ہو جائیں۔ اسی لیے یہ بحث بارہ گھنٹے قبل چھڑ گیا اور ہماری تمام رات اس الجھن میں یا تو جاگ کر کٹی ورنہ جہاں آنکھ جھپکی نہایت خوفناک خواب دیکھے۔ ایک مرتبہ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک لق و دق صحرا ہے۔ نہ آدمی نہ آدم زاد بس ہم تھے یا خدا کی یاد کہ ایک طرف سے ہاتھی کے برابر بکرا ہماری طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ ہم بھاگے لیکن بکرے نے ہم کو پکڑ لیا۔ اور بجائے "میں میں" کرنے کے بالکل انسانوں کی طرح نہایت سلیس اردو میں کہا۔ "بھاگتا ہے بھاگ کر کہاں جائے گا۔ تجھ کو معلوم نہیں کہ تو بکروں کی دنیا میں ہے اور ہمارے یہاں انسانی عید ہے۔ ہم تجھ کو قربان کر کے ثواب بھی لوٹیں گے اور کباب بھی کھائیں گے۔" ہم بید کی طرح لرزنے لگے اور بمشکل ہکلا ہکلا کر اور غیر ارادی طور پر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "حضور بکرے صاحب ہم آپ کے غلام ہیں جو چاہے کیجیے۔ آپ اشرف المخلوقات ہیں لیکن اتنا ضرور عرض کریں گے کہ اگر آپ نے ہماری جان بخش دی تو آپ کو قربانی سے زیادہ ثواب ہوگا اور میں زندگی بھر آپ کا خادم رہوں گا۔" بکرے نے اپنی داڑھی ہلائی اور پان چبا کر جس کو ہم لوگ جگالی کرنا کہتے ہیں۔ "اچھا اب اپنی منطق نہ جھاڑو چپکے سے ہمارے ساتھ چلے آؤ اور ہم تم کو جنت روانہ کر دیں۔" ہم برابر تھرتھرا رہے تھے اور منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ ہم کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ اس ظالم بکرے نے ہم کو گویا

کر اس طرح منہ میں دبا لیا جس طرح بلی اپنے بچے کو دبا لیتی ہے یا چوہے کو پکڑ کر بھاگتی ہے۔ ہم نے بہت کچھ ہاتھ پیر پھیلائے لیکن سب بے کار اور ظالم بکرا جیسے کچھ سنتا ہی نہ تھا۔ اس نے لے جا کر ایسی جگہ منہ سے چھوڑا جہاں اسی کے برابر سینکڑوں بکرے تھے اور ہماری طرح کے بہت سے انسان کھونٹوں سے بندھے کھڑے تھے ہم کو بھی ایک کھونٹے سے باندھ کر کھڑا کر دیا گیا اور سامنے کچھ تھوڑا سا چارہ ڈال کر ایک طشت میں پانی ڈال دیا۔ ہمارا مالک بکرا ہم کو باندھ کر اور ہمارے کھانے پینے کا انتظام کر کے چل دیا۔ ہم بندھے ہوئے کھڑے تھے۔ اور اپنے گناہوں سے توبہ کر رہے تھے کبھی بال بچوں کی یاد ستاتی تھی اور کبھی قربانی کے خوفناک تصور سے خون خشک ہو جاتا تھا لیکن ع

"موت آتی تھی پہ نہ آتی تھی"

سر پر قضا منڈلا رہی تھی آنکھوں میں چھری پھر رہی تھی اور ایک عجیب عالم تھا عجیب کیا بس یہ سمجھ لیجیے کہ وہی عالم ہم پر گزر رہا تھا جو قربانی کے بکرے پر گزرتا ہوگا۔ ہم نے اپنے قریب بندھے ہوئے دوسرے آدمیوں کو مخاطب کرنا چاہا لیکن ان کو بھی رونے گڑگڑانے اور دعائیں مانگنے سے فرصت نہ تھی۔ لیکن ہم نے اپنے ہمنوا کو مخاطب کر ہی لیا۔

"آپ ہی کچھ فرمائیے کہ اب کیا کریں؟"

بڑے میاں نے بالکل بکروں کی ایسی بھرائی ہوئی آواز نکال کر کہا۔

"خدا کو یاد کرو۔" اور پھر دعا میں مصروف ہو گئے۔ ہم نے بھی دعائیں کرنا شروع کر دیں۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں وہ ظالم بکرا ایک لمبی چوڑی چھری اپنے پیروں میں سے ایک کے کھر میں لیے ہوئے آتا نظر آیا اور ہم نے اس کو دیکھتے ہی بدحواس ہو کر اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ چیخے چلائے لیکن اس ظالم نے ذرا بھی رحم نہ کھایا اور آتے ہی ہم کو کھونٹے سے کھول کر چاروں شانے چت زمین پر گرا دیا۔ ہم ایک دم سے چونک پڑے آنکھ کھل گئی گھڑی دو بجا رہی تھی اور لیمپ کی دھیمی روشنی غالباً بکرے کا افسانہ خاموش کہہ رہی تھی اور ہمارا دل دھڑک رہا تھا اور پسینہ سے تمام جسم تر تھا۔ ابھی اس کیفیت کو مشکل سے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ رات کے سناٹے میں بکرے کی دلخراش آواز کچھ اس طرح ہمارے کانوں میں آئی کہ ہم اچھل پڑے۔ ارادہ کیا کہ ابھی صبح ہونے میں دیر ہے لاؤ چپکے سے بھاگ چلیں۔ پھر دل نے کہا کہ لاحول ولا قوۃ یہ فرار تو گویا اعتراف بزدلی ہوگا بخصوصیت سے ایسی حالت میں جب کہ ہم کو معلوم تھا کہ:

"نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد۔"

ہم نے اپنے دل کو مضبوط کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اپنے آباؤ اجداد کی بہادری کے افسانے دل ہی دل میں دہرانے لگے۔ ہمارے رشتے کے ایک دادا تھے جنہوں نے شیر کے جبڑے میں ہاتھ ڈال کر پھاڑ دیا تھا۔ اور نانا مرحوم کا یہ قصہ تو بچہ بچہ کی زبان پر ہے کہ بھینس کی پیٹھ پر جو

گھونسہ رسید کیا تو وہ بیچاری دور ہو گر پڑی۔ اس کے علاوہ ایک اور کوئی ہمارے بزرگ گذرے ہیں جنہوں نے پچاس مسلح ڈاکوؤں کا تنہا مقابلہ کیا تھا۔ اور ایسا مقابلہ کہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑا۔ ان خاندانی روایات نے دل کو تقویت پہنچائی اور ہم نے بہادری کو اپنی خاندانی روایات سمجھ کر اپنے کو بھی نجیب الطرفین بہادر سمجھ لیا۔ ہم ان خیالات میں محو تھے کہ آخر حصہ شب کی خواب آور ہوا کا ایک ایسا خنک جھونکا آیا کہ ہماری آنکھیں بند ہو گئیں۔ آنکھیں بند ہی ہوئی تھیں کہ دیکھتے کیا ہیں کہ قوس قزح کے برابر ہلال کی طرح خمیدہ چھری آنکھوں کو خیرہ کرتی ہوئی ہماری طرف آ رہی تھی۔ ہم جوتے چھوڑ کر بھاگے اور سرپٹ بھاگتے رہے۔ آگے آگے ہم تھے اور پیچھے پیچھے وہی چھری کہ یکایک ایک سرخ رنگ کے دریا کے کنارے ہم کو ٹھہر جانا پڑا۔ غور سے جو دیکھا تو وہ دریا خون کا تھا۔ ہم سوائے ٹھہر جانے کے اور کر ہی کیا سکتے تھے۔ لیکن اب تو وہ چھری ہم سے اس قدر قریب تھی کہ پلک جھپکی اور گردن صاف۔ لہٰذا ہم موت کو برحق سمجھ کر اس دریائے خون میں کود پڑے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ ہماری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت بھی ہم پسینہ میں غرق تھے اور معلوم ہو رہا تھا کہ واقعی چھری نے ہمارا تعاقب کیا ہے۔ سانس پھولی ہوئی تھی اور دل کی دھڑکن پنجاب میل بنی ہوئی تھی۔ ہم نے لاحول ولا قوۃ پڑھ کر پسینہ خشک کیا اور کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اس لیے کہ

صبح قریب تھی۔ ایک جانور ککڑوں کوں" کی صدائیں بلند کر کے ہم کو نماز یاد دلا رہا تھا۔ چنانچہ مرغ سحر کی اذان سے ہم کو نماز پڑھنے کا خیال آیا۔ وضو کیا اور سچے مسلمان کی طرح نماز پڑھنے کا خیال آیا وضو کیا اور ایک سچے مسلمان کی طرح نماز پڑھ کر دعا مانگی کہ اے عزت دینے والے اور اے آبرو کے مالک تو ہی اس قربانی کے امتحان میں ثابت قدم رکھے گا تو ہم سرخرو ہو سکیں گے ورنہ ایک عورت کی نظروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذلیل ہو کر رہ جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ نماز اور دعا کے بعد سے ایک بوجھ سا اتر گیا اور ہم خود بخود کچھ مطمئن سے ہو گئے۔

گھر میں بھی سب جاگ چکے تھے۔ کچھ نہا دھو رہے تھے اور جو نہا دھو چکے تھے وہ کپڑے تبدیل کر رہے تھے۔ بہرحال گھر میں تہواری فضائیں پیدا ہو چکی تھیں۔ ایک ہم تھے جو افیونیوں کی طرح قربانیوں کی پینگ میں "غین" تھے کہ بیگم نے جبہ سنپال کی طرح کمرے میں آکر زناٹے سے کہا۔ "ارے آپ نہائے نہیں؟"

ہم نے چونک کر کہا۔ "نہیں میں تو نہایا نہیں۔"

کہنے لگیں۔ "تو اب کب نہائیے گا۔ معلوم بھی ہے بقر عید کی نماز جلد ہوتی ہے؟"

ہم نے ٹرنک سے کپڑے نکالتے ہوئے کہا۔ "غسل خانہ خالی ہے؟"

کہنے لگیں۔ "جی ہاں خالی ہے جائیے نہا دھو لیجئے قربانی میں دیر ہو رہی ہے۔"

بس ظالم نے قربانی کا ذکر کر کے تمام حوصلے پست کر دیے لیکن ہم نے نہایت مضبوطی کے ساتھ کہا: "جلدی ہی کیا ہے؟"

آنکھیں نکال کر کہنے لگیں: "جلدی ہی کیا ہے یعنی سات بجنے کو ہیں اگر اگر گوشت جلدی نہ ملا تو کس طرح کھانا جلدی تیار ہو گا۔ جائیے نہا دھو کر قربانی سے پہلے تو نماز بھی پڑھنا ہے۔"

پھر وہی قربانی کا ذکر اور ہماری دہشت لیکن ہم نے اضطراب کو بمشکل چھپانے کی کوشش کی اور کپڑے لے کر غسل خانہ میں گھس گئے۔ نہا دھو کر عیدگاہ پہنچے۔ عید کی نماز بھی ایک سچے مسلمان کی طرح ادا کی اور ہنسی خوشی عید ملتے ہوئے گھر کو روانہ ہوئے جیسے ہم کو قربانی کرنا ہی نہ تھی لیکن گھر کے قریب پہنچ کر دور سے دیکھتے ہیں تو سامنے ہی قصاب بیٹھا چھریاں تیز کر رہا تھا۔ دل نے کہا کہ ابھی موقع ہے کھسک جاؤ اور ہم نے بھی ارادہ کر لیا تھا لیکن عین اسی وقت اس بزقصاب نے ہم کو دیکھ لیا۔ اور جھک کر سلام کیا۔ اب بھاگنا ذرا خودداری کے خلاف تھا۔ لہٰذا ہم سنبھل گئے۔ اور اتو کرتے ہوئے گھر تک پہنچے۔ بیگم چلمن سے جھانک رہی تھیں غالباً ہماری منتظر ہوں گی۔ ہم کو دیکھتے ہی کہنے لگیں۔ "ادھر آئیے ایک بات سن لیجئے۔"

ہم تعمیل ارشاد میں حواس باختہ ان کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اتنی سی دیر میں کہ ہم عیدگاہ گئے نماز پڑھی نہ صرف بزقصاب ہی کو بلا لیا تھا بلکہ انجمن عالیہ اسلامیہ ایک آنہ فنڈ کا وہ مطبوعہ اشتہار بھی منگا لیا تھا جن میں مساجد کی مرمت

کی اپیل تھی اور قربانی کی کھالوں کا مطالبہ اور اسی کے ساتھ قربانی کی دعا بھی لکھی ہوئی تھی۔ بیگم نے وہ اشتہار دیتے ہوئے کہا۔ "لیجیے اس کو پڑھ لیجیے اور جلدی سے قربانی کر دیجیے بڑی دیر ہو رہی ہے۔"

ہم نے وہ اشتہار اس طرح لیا گویا وارنٹ گرفتاری کو یا پھانسی کا تحریری حکم اور مری ہوئی چال سے پہنچے۔ اس ظالم قصائی کے پاس جو چھریوں سے کھیل رہا تھا۔ اس نے ہم کو تیار دیکھ کر بکرے کو کھونٹے سے کھولا اور ہم کو ایک چھری پکڑا دی۔ یہ چھری بالکل معمولی سی تھی یعنی نہ بہت لمبی چوڑی نہ بہت زیادہ وزنی لیکن نہ معلوم کیا بات تھی کہ ہمارے ہاتھوں میں ایک تھرتھری کا رعشہ پیدا ہو گیا اور چھری ہماری گرفت سے نکلی جاتی تھی۔ قصائی نے ہم کو بے وقوفوں کی طرح کھڑے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "پڑھیے دعا۔"

اور ہم نے اس کے حکم کی اس فرمانبرداری کے ساتھ تعمیل کی گویا وہ ہمارا کسی وقت کا استاد ہی تو تھا۔ خدا جانے ہم نے مساجد کی مرمت والی اپیل پڑھی یا قربانی کی کھالوں کا مطالبہ بہرحال یہ تو اچھی طرح یاد ہے کہ اس گھبراہٹ کے موقع پر ہم سے دعا کی عربی عبارت نہیں پڑھی گئی تھی اور نہ ہجے کرنے کا موقع تھا ہم تو خدا جانے کب تک اس اشتہار پر نظریں جمائے کھڑے رہتے لیکن جب قصائی نے تقاضے کے طور پر پوچھا کہ "پڑھ چکے؟"

تو ہم کو بھی مجبوراً گردن ہلا کر "جی ہاں" کہہ دینا پڑا۔ یہ سنتے ہی وہ ظالم

بکرے کی طرف کچھ اس طرح جھپٹا کہ ہمارا ہاتھوں والا رعشہ برقی رو کی طرح تمام جسم میں پھیلتا ہوا پھر دل تک پہنچ گیا اور چھری بھی کچھ اس طرح ہمارے ہاتھوں میں گت ناچنے لگی کہ گویا ہم دانستہ اس کو نچا رہے تھے۔ قصائی نے بکرے کے ہاتھ پیر یعنی چاروں ٹانگیں پکڑ کر دھم سے گرا دیا اور ہم گرتے گرتے بچے۔ اس نے اپنے چارخانے والا سرخ رومال کندھے سے اتار کر بکرے کی آنکھوں پر باندھ دیا حالانکہ اس کو ہماری آنکھوں پر پٹی باندھنا چاہیے تھی لیکن ہم نے سوچا کہ منہ پھیر لیں گے۔ قصائی نے کہا۔ "لیجیے بسم اللہ اللہ اکبر"۔ ہم نے ذرا رعشہ کو دور کرنے کی کوشش کی رعشہ تو اور بھی بڑھا کر نہایت معصومیت سے پوچھا۔ "پھیر دیں چھری؟"

اس نے کہا۔ "میاں کہہ تو رہا ہوں پھیریئے نا۔ بسم اللہ اللہ اکبر"۔ چھری ہمارے ہاتھ سے گر پڑی اور ہم نے ادھر دیکھ کر جلدی سے تین چار مرتبہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کو اٹھا لیا اور از سر نو لپٹنے کو قربانی کے لیے تیار ہونے لگے۔ بیگم نے چلمن کے پیچھے ہی سے کہا۔ "آپ کیا کر رہے ہیں؟ جلدی سے چھری پھیر کر چلتی کیجیے۔" ہم نے اب کی دل مضبوط کر کے منہ ادھر پھیرا اور چھری ادھر چلائی۔ قصائی نے ہمارا منہ دیکھ کر کہا۔ "حضور ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔" اس کا یہ کہنا تھا کہ گویا ہم پر سینکڑوں جوتے پڑ گئے۔ ہم نے زبردستی کی ہنسی جس کو کھسیانی ہنسی کہتے ہیں ہنس کر کہا۔ "اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے؟" وہ نامعقول بے تمیز کہیں کا کہنے لگا۔ "مگر آپ تو جیسے ڈرے ہی جاتے ہیں۔ شاید پہلی مرتبہ قربانی کر رہے ہیں۔"

ہم نے جل کر کہا: "اور نہیں تو کیا نری طرح خاندانی بزقصاب ہیں۔"

کہنے لگا: "حضور یہ میں نہیں کہتا۔ میرا مطلب تو یہ ہے کہ آپ ذرا ہمت سے کام لے کر بس چھری پھیر ہی دیں جس قدر آپ دیر کریں گے۔ اسی قدر ڈر اور بڑھے گا۔" اس سے پہلے کہ ہم اس بدتمیزی کا کوئی جواب دیں۔ بیگم نے پکار کر کہا۔

"ادھر آئیے۔"

ہم نے کہا کہ خیر یہ اتنی دیر کی مہلت اور مل گئی۔ لیکن بیگم نے بلا کر جب کہا کہ: "خدا کے واسطے بزقصاب کے سامنے تو بزدلی نہ دکھائیے۔"

بس دل یہ چاہا کہ اپنی ہی گردن پر چھری پھیر کر اس قصہ کو ختم کر دیں لیکن جس سے ایک جانور کی جان نہ لی جاتی ہو وہ بھلا اپنی جان کیا دیتا۔ لہٰذا یہ تجویز بھی یوں ہی رہ گئی اور ہم تنتناتے ہوئے قصائی کے پاس اس طرح گئے گویا اب کی ہم اس کو بھی ذبح کر دیں گے اور بکرے کو بھی اور جاتے ہی کہا۔ "ہاں تو اب پھیر دوں چھری؟"

اس نے تیار ہو کر کہا۔ "جی ہاں پھیر دیئے۔ بسم اللہ اللہ اکبر۔" اب کی اس بکرے کو جو شرارت سوجھی تو لگا ٹانگیں اچھالنے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ایسی صورت میں چھری پھیرنا کس طرح ممکن تھا۔ پھیرنے کو تو ہم پھیر ہی دیتے لیکن اگر تڑپنے میں ہمارا ہاتھ بہک جاتا اور چھری خدانخواستہ اس کے کہیں اور لگ جاتی تو کیا ہوتا۔ لہٰذا ہم نے قصائی کو ہدایت کی کہ بکرے کو قابو میں لائے اس کے بعد ہم چھری

پھیر ہی لیں گے لیکن اس گدھے نے کہا کہ: "ابھی آپ تو بس چھری پھیر دیجئے۔"

ہم نے غصہ سے اس کو ڈانٹ کر کہا: "تم بھی عجیب بے وقوف ہو۔ اس طرح میں چھری کیسے پھیر دوں؟"

یہ لوگ بڑے منہ پھٹ ہوتے ہیں۔ چنانچہ بدتمیزی تو دیکھئے کہ ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے اس گستاخ نے کہا کہ "تو پھر جانے دیجئے۔" اس جواب پر ہم سے ضبط نہ ہو سکا اور ہم چھری اور ہم چھری وہیں پھینک کر کمرے میں چلے آئے۔ اور بیگم سے صاف کہہ دیا کہ اب تم ہی قربانی کر دو۔ میں تو اس بدتمیز قصائی کی برداشت نہیں کر سکتا۔"

بیگم کا ہمیشہ سے یہ دستور ہے کہ ہمارے مقابلہ میں قصائی تو کیا اگر کوئی بھنگی بھی ہو گا تو اس کی طرف داری کریں گی اور ہم کو جلائیں گی۔ چنانچہ اس موقع پر بھی انہوں نے قصائی کی بے جا طرف داری کی اور کہنے لگیں: "اس نے کون سی ایسی بات کہی جو آپ کو اس قدر غصہ آ گیا؟"

ارے غصہ کے ہمارے منہ سے جھاگ نکلنے لگا اور واقعی غصہ کی بات بھی تھی کہ اپنی بیوی اپنی شریک رنج و راحت اپنی رفیقہ حیات اور طرفداری کرے غیروں کی اور غیر بھی کون؟ قصائی! ہم نے غصہ سے بے قابو ہو کر کہا۔ "کوئی بات ہی نہیں کی! کوئی بات ہی نہیں کی!! اور یہ بدتمیزی کس نے کی تھی۔ کیا مر سنے؟" ہم کو اور جلانے کے لیے زہر میں بجھے ہوئے تبسم کے ساتھ فرمایا۔

"آخر یہ کون سی بدتمیزی تھی کہ وہ آپ سے قربانی کے لیے کہہ رہا تھا اور آپ تھے کہ چھری ہی نہیں پھیر سکتے تھے۔"

ہم نے اسی تیزی سے کہا۔ "تو اس کرنے کے لیے اس نے بدتمیزی اس گستاخی اور ڈرے پن سے کہا جاتا ہے۔ اب ہم نہ کریں گے قربانی تم ہی کرو۔ تم ہی کو مبارک۔" بیگم نے اپنے مخصوص مشتعل کن انداز سے کہا۔ "یہ تو خیر قربانی نہ کرنے کا بہانہ ہے۔"

ہم نے کہا۔ "بہانہ ہے؟"

کہنے لگیں۔ "اور کیا بہانہ تو ہے ہی۔ اب اس الزام کو اپنے اوپر عائد ہوتا ہوا دیکھ کر خاموش رہنا ہمارے اختیار سے باہر تھا۔ لہٰذا مارے جوش کے کمرے سے نکل کر قصائی کے پاس پہنچے اور ڈانٹ کر کہا۔

"لاؤ چھری۔"

وہ بیگم کی شہ پا کر اور بھی بدتمیز ہو چکا تھا کہنے لگا۔ "لیجیے چھری۔"

ہم نے اس کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جانے کے انداز سے گھور کر چھری لے لی اور منہ پھیر کر جھکے چھری پھیرنے کے لیے قصائی نے کہا۔

"بسم اللہ اللہ اکبر۔"

اور ہم نے دانت کٹکٹا کر چھری پھیر دی۔ چھری کا پھیرنا تھا کہ بکرا اگڑبڑا کر ایک طرف بھاگا۔ اور قصائی نے "ہائے مار ڈالا، ہائے مار ڈالا" کے شور سے گھر سر

اٹھا لیا۔ کچھ دیر تک تو ہماری سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ واقعہ کیا ہوا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ چھری اتفاق سے بجائے بکرے کی گردن پر پھیرنے کے قصائی کے ہاتھ پر پھر گئی۔ اس کے ہاتھ سے خون کا فوارہ جاری تھا اور وہ تڑپ رہا تھا۔ ہم تھے کہ چوروں کی طرح چھری لیے کھڑے تھے۔ اور بیگم تھیں کہ چلمن کے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ ادھر تمام محلہ ہمارے دروازے پر جمع تھا اور خدا جانے سب ہماری طرف انگلیاں اٹھا اٹھا کر کیا کہہ رہے تھے۔ بہرحال ہم شرم کے مارے گڑے جاتے تھے اور وہ مکار قصائی کچھ اصلی اور کچھ ہمدردی حاصل کرنے کے لیے نقلی فیل مچا رہا تھا۔

وہ دن اور آج کا دن کہ بیگم نے کبھی ہم سے قربانی کے لیے نہیں کہا اور اور اگر وہ کہیں بھی اور ہم راضی بھی ہو جائیں تو اس خبر کے بعد کہ ہم قربانی کریں گے شہر کا کوئی بڑ قصاب ہمارے یہاں نہیں آ سکتا اور گویا اب ہم کو عمر بھر کے لیے کم از کم قربانی کی طرف سے اطمینان ہو گیا ہے۔

سگریٹ

قصہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ ہمارے عہدِ برخورداریت میں ہماری ذہنیت بھی عجیب قسم کی سعادت آثار تھی اور ہمارا خیال ہے کہ اس زمانہ میں ہر انسان کی ذہنیت معقولیت سے تقریباً اسی قدر غیر متعلق ہوتی ہوگی جس قدر ہماری ذہنیت تھی۔ سب سے پہلے تو بات یہ ہے کہ ہم کو اپنے بچپن سے ایک مستقل پریشانی تھی اور ہم اندر ہی اندر اس خیال سے گھلا کرتے تھے کہ ہم کو دنیا بچہ سمجھتی ہے اور اس دنیا میں ایک بچہ سوائے اس کے اور کسی کام کا نہیں ہوتا کہ اس کے کان پکڑ کر جس کا دل چاہے دو تین چانٹے رسید کر دے۔ دل چاہتا تھا کہ کسی طرح اس مستقل ذلت سے نجات حاصل کر کے ان لوگوں میں شامل ہو جائیں جن سے آج ہم پست نظر آتے ہیں۔ اور جن کی ماتحتی میں مجبور ہیں۔ لیکن یہ بات ہمارے اختیارات

سے اسی طرح باہر تھی جس طرح اب بچہ بن جانا ہمارے امکان میں نہیں۔ نہ تو کسی قدر قد بڑھتا تھا اور نہ مونچھیں برآمد ہونے کا نام لیتی تھیں لیکن ہم نے بھی یہ طے کر لیا تھا کہ علاوہ ان دو غیر اختیاری باتوں کے اور باقی تمام باتوں میں ان لوگوں کی تقلید کریں گے جو ہم سے عمر میں بڑھ کر ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی ہم کو مختلف قسم کے شوق پیدا ہوئے۔ مثلاً نہایت سنجیدگی کے ساتھ دونوں ہاتھوں کو باقاعدہ ہلاتے ہوئے چلنا۔ ہنسنے کے لیے چوبیس گھنٹوں میں سے چند منٹ مقرر کر لینے کے علاوہ باقی وقت میں چہرہ کو شکن آلود رکھنا۔ ملازموں سے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنا رعب قائم رکھتے ہوئے گفتگو کرنا۔ اپنے ہم عمر لڑکوں کو اپنی اولاد کے برابر سمجھنا اور ان کے منہ نہ لگنا۔ اپنے سے کچھ بڑے لڑکوں سے بھی شفقت آمیز گفتگو کرنا۔ دھوبی، مہتر، حجام وغیرہ کے سلام کا گردن کی جنبش سے جواب دینا۔ انگریزی اخبار کو آرام کرسی پر لیٹ کر روزانہ اپنے منہ کے قریب پندرہ منٹ تک رکھنا۔ کھانا کھانے کے بعد ایک نیب سا خلال منہ میں پھرانا، استنجے کے لیے ڈھیلے لے جانا۔ باتیں ذرا کم کرنا وغیرہ وغیرہ لیکن یہ تمام باتیں تھیں جو ہم نے اختیار کی تھیں اور سب یکے بعد دیگرے رفتہ رفتہ ہم سے خود بخود چھوٹ کر ہم کو پھر انہی صاحبزادگی پر لے آئیں جن سے بچنے کے لیے ہم نے ان کو اختیار کیا تھا۔ البتہ بہت سی چیزوں کے ہم عادی ہو کر رہ گئے جن میں سے ایک سگریٹ بھی ہے جو شروع تو محض اس لیے کی گئی تھی کہ اس کو منہ میں دبا کر اور منہ سے دھواں نکالنے پر معمولی سے معمولی انسان میں ایک شان پیدا ہو جاتی

ہے لیکن بعد میں یہی شان اکثر و بیشتر مواقع پر گاہے گاہے کرکری ہوتی رہی۔

ہمارے گھر میں سگریٹ پینے والوں بزرگوں کی بفضلہ کمی نہ تھی۔ اس لیے علاوہ آنے جانے والوں کے لیے عمدہ قسم کی سگریٹیں ہر وقت والد صاحب کے ملاقاتی کمرے میں موجود رہتی تھیں۔ لہٰذا یہ شوق ہمارا مفت میں پورا ہوتا رہا کہ گھر سے باہر جانے لگے اور دو تین سگریٹیں ادھر ادھر دیکھ کر جیب کے اندر اور ہم زن سے گھر کے باہر۔ اس کے بعد تو گویا ہم کسی جمہوری ملک کے آزاد باشندے تھے گھر سے کچھ دور کے فاصلے پر جا کر سگریٹ ہمارے منہ میں لگ گئی اور ہم نے دھواں اڑانے کے ساتھ ساتھ اپنی چال میں ایک قسم کی اکڑ بھی پیدا کر لی اور اپنے دل میں سمجھ لیا کہ گویا اب ہم کو تمام راہ گیر بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ ہم نہایت شان سے ٹیڑھا منہ کر کے فضاؤں میں سگریٹ کا دھواں پھیلاتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ اور دل کو یقین ہے کہ ہم ایک بڑے آدمی سمجھے جا رہے ہیں کہ یکایک ہم کو کسی قریب تر گلی میں خواہ وہ کسی جانب کیوں نہ ہو۔ نہایت بدحواسی کے ساتھ گھس جانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ ضرورت کچھ ایسی ویسی معمولی ضرورت نہیں ہوتی تھی کہ اس کو ٹال دیا جائے بلکہ اگر فوراً ہی اس کی تکمیل نہ کی جاتی تو وہ تمام عزت جو سگریٹ پی کے اب تک حاصل کی تھی مع سود در سود کے دس سر بازار اتر جاتی۔ لہٰذا ہم اس معاملے میں ہمیشہ ہوشیار رہتے تھے کہ اس قسم کی ناگہانی مصیبت نما ضرورت کے پیدا ہوتے ہی کسی نہ کسی طرف نو دو گیارہ ہو جائیں گے۔ مگر توبہ کیجیے کبھی اس قسم کی

احتیاطیں ہمیشہ کامیاب ہوا کرتی ہیں؟ کبھی کبھی بھانڈا پھوٹ کر رہتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ہم سگریٹ منہ میں لیے ہوئے لاٹ صاحب کی طرح بازار کا معائنہ کرتے چلے جا رہے تھے کہ پانچ ہی قدم کے فاصلے پر جناب والد صاحب قبلہ و کعبہ کا ظہور ہوا یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ انسان کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ دل کی حرکت اگر بند نہیں ہوتی تو سول سروس کپ کی دوڑ بن جاتی ہے۔ دسمبر کے جاڑے میں پسینہ آ جاتا ہے۔ روز روشن میں آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے لیکن نہ زمین پھٹتی ہے کہ انسان اس میں سما جائے۔ نہ آسمان کو ضرورت ہوتی ہے کہ اچک کر نکل جائے۔ اس قسم کی حالت میں انسان جو کچھ بھی کر گزرے تھوڑا ہے اور واقعی جو کچھ ہوتا ہے وہ نوے غیر ارادی طور پر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہماری ہی مثال لے لیجیے کہ اس ستم کے مواقع پر بارہا تو ہم کو جلتی ہوئی سگریٹ منہ کے اندر مسلم چھپا لینا پڑی۔ بعض اوقات اس کو منہ میں چھپانے کے بعد نگلنا بھی پڑا۔ اکثر یہ ہوا کہ اس کو بجنسہٖ جیب کے اندر رکھ لیا۔ وہ خود بھی جلتی رہی اور شیروانی کو بھی چپکے چپکے جلاتی رہی۔ بعض اوقات سگریٹ کو چھوڑ کر اس پر فوراً پیر رکھ کر کھڑے ہو جانے کی ضرورت محسوس ہوئی مختصر یہ کہ اس قسم کے مواقع پر جو کچھ بھی ہم نے کیا وہ قطعاً غیر ارادی طور پر کیا اور اس میں عام طور پر ہم کو ہمیشہ کامیابی ہوئی۔ مثلاً ہم نے والد محترم کو دیکھ کر سگریٹ کو بغیر بجھائے ہوئے جیب میں رکھ لیا اور چلتے رہے۔ کوشش کی کہ نظر بچا کر نکل جائیں۔ اگر کامیاب ہو گئے تو خیر ورنہ انہوں نے روک کر کہا۔

"میاں کہاں پھر رہے ہو؟"

"جی یوں ہی۔ ذرا ایک لڑکے سے کتاب لینے جا رہا ہوں۔" جیب میں سگریٹ جل رہی ہے اور استر بھی۔

"تو کیا تمہارے پاس وہ کتاب نہیں ہے؟"

"ہے تو۔ نہیں ہے۔" یعنی ذرا خراب ہے اس کے کچھ ورق نہیں ہیں۔ پرانی ہے۔" منہ ہٹائے ہوئے کہ کہیں بدبو نہ سونگھ لیں۔

"بھائی تو نئی لے آتے یہ بھیک مانگنا تو اچھا نہیں۔"

"جی ہاں لے آؤں گا، کل پرسوں مگر یعنی کہ اونہہ آج ہی دیکھنا ہے۔..."

... استر جلا کر سگریٹ گر پڑی اور ہم نظر بچا کر اس سے گذر گئے۔

"اچھا تو جلد واپس آنا۔"

ہم جان بچی لاکھوں پائے کہہ کر وہاں سے کھسکے لیکن شاید آپ کو یہ نہ معلوم ہوگا کہ اس دوران میں کتنا خون خشک ہو گیا اور کتنا خون پانی بن کر بشکل پسینہ بہ گیا بہرحال کوشش کامیاب ہو گئی اور کوشش ہی کیا کہیے کہ خدا نے عزت رکھ لی۔ شیروانی کا جیب اور اس سے متصل تھوڑا سا پاجامہ ضرور جل گیا لیکن ہم کو ستی ہونا نہیں پڑا۔ یہ تو مثال اس قسم کے حادثات کی ہے جس میں ہم محفوظ رہے۔

"رسید بود بلائے ولے بخیر گذشت" کا معاملہ ہو کر رہ گیا۔ لیکن بعض اوقات ہم اس بری طرح پھنسے ہیں کہ خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ اسکول میں ماسٹر صاحب سے پیشاب کی اجازت لے کر پاخانہ جا رہے تھے تاکہ سگریٹ پی لیں۔ اس لیے کہ واضح رہے کہ اسکول میں پاخانے سے سگریٹ نوشی کی کوئی پرامن جگہ نہیں ہے پاخانے کے قریب پہنچ کر جیسے ہی ہم نے دیا سلائی اور سگریٹ کی ڈبیہ نکالی ہے۔ کسی نے پیچھے سے آنکھیں بند کر لیں۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ یہ شریر سلیمان کی حرکت ہے۔

"ابے چھوڑ مردود کہیں کے۔"

مگر وہ چپ رہا۔ ہم نے پھر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ابے چھوڑتا ہے کہ نہیں او گدھے کہیں کے۔ ارے یار چھوڑ دو۔ ہیڈ ماسٹر صاحب آتے ہوں گے۔ اچھا بیٹا نہ چھوڑو۔ اچھا اب ہو چکا مذاق چھوڑ دو۔ ابے سلیمان، او سلیمان کے بچے چھوڑ۔ اگر سگریٹ پینا ہے تو چھوڑ دے۔"

اس نے ایک ہاتھ سے سگریٹ لے لی اور ہم نے کہا۔

"ہاں سگریٹ لے لو مگر مجھے چھوڑ دو۔"

اب ہم آزاد تھے مگر گھوم کر وہ منظر دیکھا ہے کہ اگر کوئی کمزور دل کا انسان ہوتا تو اس کی روح وہیں [illegible] سے عالم بالا کی طرف پرواز کر جاتی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ہیڈ ماسٹر صاحب سگریٹ اور دیا سلائی لیے ہوئے کھڑے ہیں اور ہم کو گھور رہے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کا ہم کو مطلق علم نہیں، اس [illegible] ہم اپنے حواس میں نہ رہے۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ ایک درجن کے اندر ہی اندر بید پڑے تھے۔

مگر خدا خدا کر کے وہ دور گیا گھر میں بھی ہم آزادانہ دھواں دھار سگریٹ نوشی کرنے لگے اور باہر بھی، اسکول سے بھی نجات مل گئی اور والد صاحب کا بھی ڈر اٹھ گیا، لیکن اب ہماری شریک حیات کچھ سکھ قسم کی خاتون معلوم ہوتی ہیں جو سگریٹ کے دھوئیں کو حرام اور اس کی بدبو کو مکروہ سمجھتی ہیں قصہ مختصر یہ کہ ہمارا بالکل یہ حال ہے کہ

ے جب تو گھبرا کے یہ کہتے تھے کہ مر جائیں گے
اب مرے ہیں تو یہ کہتے ہیں کدھر جائیں گے

قطع کلام

یہ تو ہم کہتے ہیں کہ میر صاحب جان بوجھ کر ہم کو چھیڑتے ہیں لیکن ان کی یہ عادت کہ اپنے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو بات ہی نہ کرنے دیں گے۔ بعض اوقات اس قدر تکلیف دہ ثابت ہوتی تھی کہ دل چاہتا تھا کہ یا تو خود اپنا سر دیواروں سے ٹکرا کر پھوڑیں یا میر صاحب قبلہ کا منہ نوچ لیں لیکن ہوتی ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہ تھی اور ہمیشہ دانت پیس کر رہ جانے پر معاملہ ٹلتا رہتا تھا لیکن میر صاحب تھے کہ ہماری اس خاموشی سے فائدہ اٹھا کر روز بروز شیر ہوتے جا رہے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ان کو متوجہ ہی کیوں کرتے تھے جو اس عذاب میں مبتلا ہوں لیکن آپ کو یہ نہیں کہ وہ ایک باوضع انسان تھے جس سے ایک مرتبہ صاحب سلامت ہو گئی بس مرتے دم تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔

خواہ وہ کیسی ہی بے رخی برتتے لہٰذا ان کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہوتی تھی کہ کوئی ان کو متوجہ کرے بلکہ وہ تو خود متوجہ کر لیا کرتے تھے اور بس یہی ان کے لیے کافی ہوتا تھا۔

اب آپ ہی بتلائیے کہ یہ ہم سے کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم نے تو ان کو راستہ میں دیکھ کر منہ چرایا اور انہوں نے ہم کو دیکھتے ہی گرفتار کر لینے کے انداز سے "السلام علیکم" کہا۔ ظاہر ہے کہ اب ہم جواب دینے کے پابند ہو گئے اور "وعلیکم السلام" کہہ کر مجرموں کی طرح ان کے سامنے خاموش کھڑے ہو گئے۔ اس لیے کہ ذرا بھی بولے تو پھر بولنے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ لیکن انہوں نے خود دریافت کیا:۔

"کہیے اب بلند اقبال کا کیا حال ہے؟"

ہم نے بات ٹالنے کے لیے نہایت اختصار کے ساتھ عرض کیا۔

"وہی حال ہے۔"

حیرت سے آنکھیں نکال کر کہنے لگے۔

"وہی حال ہے یعنی اب تک اسہال کا سلسلہ جاری ہے؟"

عرض کیا۔ "جی ہاں جاری تو ہے مگر یہ آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ کبھی بخار ہے تو کبھی کھانسی، کبھی آنکھ دکھ رہی ہے تو کبھی جگر بڑھا ہوا ہے۔ کبھی۔۔۔"

بات کاٹ کر کہنے لگے۔

"آپ کا قطع کلام ہوتا ہے۔ یہ تو سب کچھ ہے جناب مگر اس کو معمولی نہ سمجھیے

بلکہ باقاعدہ علاج کیجیے ورنہ معدہ اسی کا عادی ہو جائے گا اور پھر کچھ بنائے نہ بن پڑے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ماں کا دودھ خراب ہے، ورنہ وہ بد پرہیز ہیں اور بالکل وہی معاملہ ہے جو کپتان عبدالغفور خان کے بچہ کی علالت کے سلسلہ میں پیش آیا کہ بچہ بیمار ہے اور یہی اسہال جاری ہیں۔ تمام دنیا کے اطبا، انگریزی یونانی کو علاج ہو چکا ہے اور اب تمام خاندان اس بچہ کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ ایک موٹا تازہ گلاب کے پھول کی طرح شاداب بچہ اور اب... معلوم یہ ہوتا تھا کہ بس ہڈی اور چمڑا رہ گیا ہے۔ آخر میں میں نے حکیم محمود خان اعظم کو دہلی خط لکھا۔ میرے ان کے بہترین تعلقات تھے اور مجھے بہت مانتے تھے۔ بلکہ جب کبھی میں دہلی جاتا تھا تو ان ہی کے یہاں ٹھہرتا تھا۔ دن دن بھر شطرنج جمی رہتی تھی۔ ان کو اپنے شاطر ہونے پر بڑا ناز تھا۔ لیکن اگر انہوں نے کسی کا لوہا مانا ہے تو وہ یہ خاکسار ہے۔ مگر ایمان کی کہوں گا کہ ان کے اٹھ جانے کے بعد سے مجھ کو بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے ساتھ ٹکر کی شطرنج کھیلنے والا اب کوئی نہیں ہے۔ اور پھر شطرنج کھیلنے میں مرحوم کے لطیفے۔ ہائے ہائے کیا انسان تھا اور کہاں ہے کہ ایسے انسان اب پیدا ہوں گے۔ تو ہاں جناب میں نے ان کو خط لکھا کہ کپتان عبدالغفور کے بچے کا یہ حال ہے اور اب آپ ہی سے امید ہے کہ خدا آپ کے ہاتھ سے شفا دے گا۔ خط ڈال کر میں مطمئن ہو گیا اور کپتان صاحب کو بھی اطمینان دلایا لیکن وہ تو اس بچہ کی طرف سے بالکل مایوس ہی تھے۔ ان کو اطمینان نہیں ہوا۔ بہرحال پانچویں دن میرے خط کا جواب آیا۔ میں نے بڑے شوق سے لفافہ

کھولا تو دیکھتا کیا ہوں کہ اس میں صرف یہ لکھا ہوا ہے کہ ماں کا دودھ چھڑا کر بکری کا دودھ دیا جائے۔ باقی جو علاج بھی ہوگا مفید ہوگا۔ مجھ کو یہ خط دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ اور میں کپتان صاحب سے بڑا نادم تھا کہ وہ کیا کہیں گے لیکن جب کپتان صاحب نے خود حکیم صاحب کے خط کا تقاضا کیا تو میں نے خط نکال کر چپکے سے دکھایا۔ معلوم نہیں کیا بات تھی کہ جو بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ کپتان صاحب کے ذہن میں جم گئی اور انہوں نے فوراً ایک جمنا پاری بکری خریدی۔ اس کا دودھ بچہ کو شروع کرا دیا اور ماں کا دودھ بند کر کے باقی تمام علاج بھی بند کر دیا لیکن جناب خدا کو یہ منظور تھا کہ حکیم محمود خاں کے سر سہرا رہے اور میں سرخرو ہوں لہٰذا بچہ کو چٹکی بجاتے ہی فائدہ ہونا شروع ہوا اور اب ماشاءاللہ خود بچوں والا ہے اور دہلی میں نہایت دھڑلے کی بیرسٹری کر رہا ہے تو جناب آپ اس کا دودھ بند کرا دیجیے۔"

ان کی بکواس سے تنگ آ کر میں نے کہا۔

"اور بکری بھی خرید لوں۔"

بس پھر گویا میں نے آتش بازی کے قلعہ میں دیا سلائی لگا دی، کہنے لگے۔

"اجی بکری خریدو یا گائے کا دودھ دو مگر ماں کا تو ہرگز ہرگز دودھ نہ دو۔"

ہم نے اس خیال سے کہ اب یہ ہم کو چھوڑ دیں گے۔

"بہت بہتر۔"

یہ کہہ کر اجازت حاصل کرنے کے لیے ارادہ ہی کیا تھا کہ وہ پھر بولے۔

"مگر اس سے پہلے کہ اس کو بکری وغیرہ کا دودھ دو مجھ کو اس کا پورا حال بتاؤ کہ شاید میں کوئی مشورہ دے سکوں۔" عرض کیا۔

"اس کو چھ ماہ سے یہ شکایت پیدا ہو گئی ہے کہ بالکل اچھا خاصا ہے نہ کوئی بیماری ہے نہ کچھ..." بات کاٹ کر کہنے لگے۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ خدا کرے وہ ایسا ہی رہے پھر آپ چاہتے کیا ہیں؟" عرض کیا۔

"سنئے تو ہی میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ وہ بالکل اچھا رہتا ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی...." بس یہیں سے میری زبان بند کر کے کہنے لگے۔

"بھائی وہی تو میں بھی کہتا ہوں کہ خدا کا شکر کرو اور تم کو کیا چاہیے۔"

ہمارا دل چاہا کہ میر صاحب کی اور اپنی جان ایک کر دیں لیکن ان کی بزرگی کا خیال آیا اور ہم نے ضبط کر کے کہا۔

"پوری بات بھی سنئے گا یا نہیں، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ایک دم سے اس کو دست آنے لگتے ہیں۔" پھر ہماری زبان بند کر دی اور تڑ سے بول دیے۔

"اچھا اچھا۔ اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی۔ ہاں ہوتا یہ ہے کہ اکثر بچوں میں اور یہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے خود میرے پہلے لڑکے کا بالکل یہی حال تھا تو ہاں آپ پورا فرمائیے پھر میں عرض کر دوں۔" ہم نے عرض کیا۔

"دست آنے کے ساتھ ہی کمزوری اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بس لت پت ہو

ہو جاتا ہے اور ...۔" ان کی زبان پھر رُانی اور خود بخود چل دی۔

"یہ بھی کوئی گھبرانے کی بات ہے۔ اس لیے کہ دست آنے کے بعد کمزوری کا ہونا ضروری ہے۔ ہاں تو پھر ...؟"

ہم نے جلدی جلدی گھاس کاٹنے کے انداز سے کہنا شروع کیا اور طے کر لیا کہ اب سانس نہ لیں گے۔ ورنہ جہاں سلسلہ ٹوٹا وہیں یہ کم بخت بولنا شروع کرے گا۔ چنانچہ ہم حال کہہ رہے تھے اور ہماری تیز گفتاری سے اس طرح مجبور تھے جس طرح تھوڑی دیر تک موٹر سائیکل کا تعاقب کرنے کے بعد کتا مجبور ہو جاتا ہے لیکن ان کا بولنے کو کچھ اس طرح دل چاہ رہا تھا کہ وہ بے چین سے ہونے لگے۔ ایک آدھ مرتبہ تو ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے منہ کھول کر کہہ دیا۔

"آپ کا قطع کلام ہوتا ہے لیکن یہ حال اور بالکل یہی حال میری بھانجی کے لڑکے کا ہے جسے میں نے کرنل اسٹیولٹ تک کو دکھایا مگر فائدہ ہوا تو حکیم احسان اللہ خان کے علاج سے اور وہ بھی چٹکی بجاتے ہوئے یعنی اس اللہ کے بندے نے خدا اس کی عمر میں برکت دے چار پیسے کا ایک مجرب نسخہ لکھ دیا کہ چار ہزار روپیہ میں بھی سستا ہے۔" ہم نے عرض کیا "سستے اور مہنگے کا خیال نہیں بات تو یہ ہے کہ۔

"سستے اور مہنگے کا خیال نہیں بات تو یہ ہے کہ ..." کہنے لگے۔

"ذرا معاف کیجیے گا آپ کا قطع کلام ہوتا ہے، میرا یہ مطلب نہیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ دیکھیے کہ اس کم حقیقت گھاس پھوس میں خدا نے کیا قدرت رکھی ہے

اور یہی خس و خاشاک بعض اوقات آبِ حیات ثابت ہو کر رہتی ہے۔" عرض کیا۔

"یہ بالکل صحیح ہے۔" کہنے لگے۔

"آپ کا قطع کلام ہوتا ہے۔ صحیح نہیں ہے بلکہ یہ دیکھیے تو کہ خداوند کریم نے اس میں اپنی قدرت کس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔" ہم بھی عجیب بے حیا تھے پھر بولے "ان اللہ علیٰ کل شیٍٔ قدیر۔ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے زہر کو بھی ..."

کہنے لگے "آپ کا قطع کلام ہوتا ہے" سچ تو یہ ہے کہ اب تو ضبط کرنا ہمارے اختیارات سے باہر تھا اور واقعی ہم کب تک ضبط کر سکتے تھے جب میر صاحب نے یہ طے کر لیا تھا کہ خود ہی بولے جائیں گے۔ ہم کو بولنے بھی نہ دیں گے بلکہ اگر ہم بولنے کی کوشش بھی کرتے تھے تو وہ ظالم ہم کو بولنے نہ دیتا تھا اور بلا تکلف ہمارے بھیجے کو کھائے جاتا تھا اگر ہم کرتے تو کیا کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوّل تو بزرگ تھے دوسرے وہ اپنے خیال سے ہمارے ساتھ یہ دشمنی بھی محبت سمجھ کر فرما رہے تھے اور ان کو واقعی اس کا احساس بھی نہ تھا کہ ان کو تکرار کلام کا مرض ہو بلکہ انہوں نے کبھی اس پر بھی غور نہ کیا کہ لوگ ان کو "میر بک بک" کیوں کہتے ہیں۔

سید صاحب مسلسل کچھ فرما رہے تھے اور ہمارے کان ان کی آواز کے اس طرح عادی ہو چکے تھے جس طرح کسی پرسکون مکان کے باہر جھینگر کی آواز غیر محسوس ہو جاتی ہے اور سماعت پر اس کا بار نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر دھوپ میں کھوپڑی چٹخنے پر بھی کوئی معقولیت ہمارے ذہن میں نہ آتی تھی۔ لہٰذا ہم کو

میر صاحب کی بکواس سے زیادہ اس کی حماقت پر غصہ آ رہا تھا۔ لہٰذا مجبوراً ہم نے طے کیا کہ میر صاحب پر ایسی دفعہ لگائیں کہ وہ بھی برا نہ مانیں اور ہمارا مطلب بھی پورا ہو جائے۔ یہ طے کرنے کے بعد ہم نے بھی وہ ترکیب نکالی کہ یاد کرتے ہوں گے آج تک میر صاحب کو کس سے سابقہ پڑا تھا۔ چنانچہ ہم نے بھی قطع کلام کا ایک توڑ ایجاد کیا اور اس ایجاد کے بعد جیسے ہی میر صاحب نے کہا۔

"بھلا میں جھوٹ بولتا ہوں؟"

اگر ہم نے یہ توڑ ایجاد نہ کیا ہوتا اور سر ہلائے جاتے اور میر صاحب اپنی ہانکے جاتے مگر ہم نے اب کی بار یہ کیا کہ جیسے ہی انہوں نے کہا کہ "بھلا میں جھوٹ بول سکتا ہوں؟" ہم نے فوراً کہا "اور کیا" "بس اب معلوم یہ ہوا کہ تیز رفتار بائیسکل میں اگلا اور پچھلا دونوں بریک لگا دیے ہیں۔ وہ ایک دم چپ ہو گئے اور ہکا بکا ہو کر ہمارا منہ دیکھتے لگے پھر کہا۔

"بھائی یہ دیکھو کہ کتے بھونکا کرتے ہیں اور قافلہ گذر جاتا ہے۔" ہم نے کہا۔ "یہ کوئی ضروری تو نہیں ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ قافلے والے ڈر کر ٹھہر جائیں اور کتوں کو جب تک ڈھیلے مار کر بھگا نہ لیں اس وقت تک نہ گذر سکیں۔"

لاپروائی سے کہنے لگے۔

"خیر یہ تو کوئی بات نہیں۔"

ہم نے پھر اپنے اختلاف سے ان کے قطع کلام کا قطع کلام کیا اور کہا۔

"بات کیسے نہیں ہے۔" جلدی سے بات ٹال کر کہنے لگے۔

"اچھا ہے بات ہے خیر ہو گی تو ہاں..." ہم نے اصرار سے کہا۔

"یہ نہ ہو گا پہلے ہم کو اس بات کی طرف سے مطمئن کیجیے پھر آگے بڑھئے۔" کچھ الجھ کر کہنے لگے۔

"لاحول ولا قوۃ۔ ارے بھائی فرض کر لو کہ چاند نکلا ہے۔" ہم نے پھر ان سے ان کے قطع کلام کرنے کا انتقام لیا۔

"چاند نکلا ہے یہ بھی ایک ہی رہی۔ ارے بھائی سورج نکلا ہے سورج۔" ڈانٹ کر کہنے لگے۔ "ارے میاں فرض کر لو۔"

ہم نے بھی کڑک کر کہا۔ "اونہہ بات کیسے فرض کر لیں کہیں دن کو بھی چاند نکلا ہے۔" کہنے لگے۔ "تو پھر جانے دو۔ عجیب قسم کے بے وقوف ہو۔"

ہم نے بات ختم کرنے کے انداز سے کہا۔ "خیر بے وقوف سہی لیکن دن کے وقت چاند کو نکلا ہوا فرض کر کے زیادہ بے وقوف بننا نہیں چاہتے۔" میر صاحب کچھ برداشتہ خاطر ہو کر چلے گئے اور ہم اپنی کامیابی اور قطع کلام کے توڑ والی کامیاب ایجاد پر خوش تھے اور اگر واقعی ہم خاموشی سے چاند کا نکلا ہوا فرض کر لیتے تو پھر وہ یہ کہہ کر کہ "اس کو دیکھ کر کتے بھونکتے ہیں مگر اس کا کچھ نہیں بگڑتا" اپنی گفتگو کا لامتناہی سلسلہ پھر شروع کر دیتے لیکن اس زبردستی کی اختلاف والی ایجاد نے ان کی قطع کلام کو بھی چاروں خانے چت کر کے چھوڑا اور ہماری جان بچی

شامت

جب کام کرنے کے بعد چھٹی پا کر نہایت اطمینان کے ساتھ ٹانگیں پھیلا کر آرام کرسی پر لیٹنے کا موقع ملتا ہے اور سلگنے والے حقہ کی روح پرور خوشبو شامہ نوازی کرتی ہے۔ اس وقت لے لگانے کو دل چاہتا ہے۔ بلکہ غیر ارادی طور پر ہم تو گانا شروع بھی کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ہم کو یہی خوش گوار لمحات میسر تھے اور ہم حقہ کی نے منہ میں لیے ہوئے زیر لب "جیا رکس کے مسکے ہو۔" پر اپنی موسیقی کے تمام کمالات صرف کر رہے تھے کہ خدا جانے کس طرف سے ایک بڑے میاں بالکل ہمارے سر پر آ پہنچے اور ہم "کس کے مسکے کس کے مسکے۔" کہہ کے ان کو دیکھتے ہی کچھ چونک پڑے۔ انہوں نے پوچھا۔

"شوکت تھانوی؟"

ہم نے کہا۔ "فرمائیے!"

انہوں نے کہا۔ "کہاں ہیں؟"

ہم نے کہا۔ "کام بتائیے۔" لیکن انہوں نے کام بتلانے سے انکار کرتے ہوئے بس ہم ہی کو ہم سے پھر پوچھا اور ہم کو مجبوراً کہہ دینا پڑا۔ "اسی خاکسار کو کہتے ہیں۔"

لیکن انہوں نے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا گویا وہ ہم کو جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔ اور فوراً مزید اطمینان کرنے کے لیے ہم سے اقبال کرا ہی لیا۔

"آپ ہی شوکت تھانوی ہیں؟"

ہم نے سچ بولنے کے انداز سے عرض کیا۔ "جی ہاں میں شوکت تھانوی ہوں۔"

معلوم نہیں بڑے میاں کو یقین آیا یا نہیں بہرحال وہ اس طرح اطمینانی سانس لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے گویا وہ عمر بھر ہماری تلاش میں رہے ہیں۔ اور اب ہم کو ڈھونڈ کر ہمارے ہی ہو پڑیں گے۔ ہم نے لاکھ لاکھ بڑے میاں کے حدود اربعہ پر نظر کی۔ لیکن سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ٹیر بازی کے ماہرین میں سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور کامدانی بنانے میں لکھنؤ کا نام روشن کیے ہوئے ہیں۔ بڑے میاں نے ہم کو پھر گھورا اور اپنا پوپلا منہ چلاتے ہوئے پھر کہا:

"آپ ہی شوکت تھانوی ہیں نا؟"

یہ سوال وہ پہلے دو تین مرتبہ دہرا چکے تھے لیکن اب ہم کو اس سوال سے ڈر معلوم ہونے لگا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ اگر یہ ملک الموت ہیں تو اس تحقیق کی کیا ضرورت ان کو خود معلوم ہوگا کہ ہم کون ہیں۔ لیکن پھر ہم نے سوچا کہ وہ پوری طرح تحقیق کرنے کے بعد روح قبض کریں گے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شوکت تھانوی کے دھوکے میں کسی اور بے گناہ کی جان لے لیں۔ لہٰذا ہم نے ذرا مضبوط ہو کر جواب دیا۔

"عرض تو کیا کہ میں ہی شوکت ہوں۔"

یہ سن کر بڑے میاں نے اپنی شیروانی نہیں بلکہ اپنی اچکن کے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہم سمجھ گئے کہ یہ انقلاب پسند جماعت کا کوئی شخص ہے اور اب اس کے ریوالور کی ایک گولی ہمارے تمام سودیشی مضامین کا انتقام لے لے گی لیکن کرتے تو کیا کرتے موت برحق تھی اور بھاگنے کا موقع نہ تھا۔ مجبوراً مرد بنے بیٹھے رہے لیکن بڑے میاں نے بجائے ریوالور کے جیب سے ایک کاغذ نکال کر رازدارانہ طریقہ سے رشوت کی طرح چپکے سے ہمارے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کاغذ پر ہمارا نام معہ پتہ بالکل اس طرح لکھا ہوا تھا۔

جناب شوکت تھانوی۔
لاٹوش روڈ۔ سرپنچ چھاپہ خانہ

"تسلیم۔ یہ ہادی حسین آتے ہیں۔ ان کو کاغذ میں سب حال تحریر کر کے دے دیجیے۔ ان کو کچھ معلوم نہیں ہے۔ نہ کہیے گا۔ فقط۔"

فقط کے بعد کسی کا کوئی نام دام نہیں تھا۔ لہٰذا خط کی عبارت ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ اردو ہماری مادری کیا بلکہ فادری زبان بھی ہے۔ دن رات اردو بولتے۔ لکھتے بلکہ اوڑھتے اور بچھاتے رہتے ہیں لیکن اس معمولی سی عبارت کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہو گیا۔ اور واللہ اگر کسی امتحان میں یہی عبارت پرچہ میں آجاتی کہ (۱) سلیس اردو میں ترجمہ کرو تو ہم کو صفر سے زیادہ کچھ نہ ملتا۔ "ہادی حسین آتے ہیں۔" خیر وہ تو آئے اور اب تک سامنے بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ لیکن "ان کو کاغذ پر سب حال تحریر کر کے دے دیجیے۔" کس کا حال؟ کیا حال؟ بس یہیں سے دماغ چکرانا شروع کرتا تھا اور پھر طرہ یہ کہ "ان کو کچھ معلوم نہیں ہے، نہ کہیے گا۔" لاکھ لاکھ دماغ پر زور دیا۔ ہر طرح سمجھنے کی کوشش کی مگر کچھ ذہن میں نہ آیا کہ یہ کس کا خط ہے اور وہ کون سی بات ہے جو چھپی ہوئی ہے۔ مجبوراً جب دماغ سوچتے سوچتے سن ہو گیا تو بڑے میاں کو اونگھنے سے ہوشیار کرنا پڑا۔

"یہ آپ کہاں سے لائے ہیں؟"

بڑے میاں:۔ "وکٹوریہ گنج سے۔"

ہم:۔ "وکٹوریہ گنج سے؟ اور کس نے بھیجا ہے؟"

بڑے میاں:۔ "منجھلی بیگم نے۔"

ہم:۔ "منجھلی بیگم نے؟ کون سی منجھلی بیگم؟"

بڑے میاں:۔ "منجھلے نواب کے گھر میں۔"

ہم :۔ "منجھلے نواب کے گھر میں؟ میں نہیں سمجھا؟"

بڑے میاں :۔ "اے جناب آپ، کیسے نہیں سمجھے؟ مجھے خود منجھلی بیگم نے یہ خط دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ آپ ہی کے ہاتھ میں دوں اور اس کا جواب لے جا کر ان ہی کو دے دوں کسی سے کچھ نہ کہوں مگر آپ سمجھتے ہی نہیں۔"

تعلقات تو یقیناً گہرے معلوم ہوتے تھے اور ہمارا نہ پہچاننا واقعی قابلِ شرم تھا لیکن ہم واقعی نہ پہچان سکے کہ منجھلی بیگم کون بلا ہیں؟"

لہٰذا ہم نے پھر کہا۔ "میرے ذہن سے ان کا خیال اتر گیا ہے۔ ذرا تم مفصل پتہ بتاؤ تو سمجھوں۔"

بڑے میاں :۔ "ارے میاں منجھلی بیگم جو کان پور کے اسکول میں پڑھتی تھیں ابھی سال بھر ہوا ان کی شادی منجھلے نواب سے ہوئی ہے منجھلی بیگم کی والدہ تین سو روپیہ ماہوار پاتی تھیں۔ ان کا تھوڑے دن ہوئے انتقال ہو گیا ہے اور اب وثیقہ بھی ان ہی کو ملتا ہے۔ وہ آپ کو خوب جانتی ہیں۔ آپ کا نام لیا پتہ بتایا مگر آپ تو اس طرح پوچھ رہے ہیں جیسے جانتے ہی نہیں۔"

اس وقت منجھلی بیگم کو نہ پہچاننا ہم کو خود برا معلوم ہو رہا تھا۔ بھلا غور تو کیجئے، پڑھی لکھی جوان لڑکی یعنی پارسال شادی ہوئی ہے۔ تین سو روپیہ نقد ملنے والی اور خوبصورت بھی ضرور ہوگی۔ ان کو ہم نہیں پہچانتے تھے۔ اب یہ ہماری بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے۔ واللہ کنواں پیاسے کے پاس آیا تھا لیکن جب پیاسا اندھا ہو جائے، اس کی عقل پر پتھر پڑ جائیں۔ اس کے دماغ میں بھس بھر جائے تو اس کا کیا علاج ظاہر ہے کہ اگر ہم منجھلی بیگم کو چراغ لے کر ڈھونڈتے تو وہ نہ ملتیں اور اب چھپر پھاڑ کر خدا نے انہیں ہم کو دیا تھا تو ہم ایسے کم بخت کہ اس نعمت سے بھی فائدہ نہیں اٹھا رہے تھے۔ واللہ منجھلی بیگم تو سونے کی چڑیا تھی جو خود بخود ہمارے ہاتھ پر آ کر بیٹھ گئی۔ ہم نے خود اپنے کو صید بنا کر پیش کیا۔ مگر واہ رے عقل کے دشمن ہم کہ اس خزانے پر لات مار رہے تھے لیکن ہم کرتے تو کیا کرتے۔ ہماری سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا کہ منجھلی بیگم کون ہیں؟ مجبوراً ہم نے ایک کاغذ اٹھایا اور لکھ دیا۔

"محترم یا محترمہ تسلیم۔ میں آپ کو بالکل نہ پہچانا آپ اپنا مفصل تعارف کرائیے۔ تاکہ یہ معمہ حل ہو جائے پھر کچھ حال لکھوں گا۔"

"شوکت تھانوی"

خط لکھا اور بڑے میاں کو دے دیا وہ خط پاتے ہی "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" ہو گئے اور منجھلی بیگم کے تصور میں ایسا غرق ہوئے کہ شاید ان سے مل کر بھی ایسا نہ ہوتے۔ طرح طرح کے خیالات ذہن میں آتے تھے اور مٹ جاتے تھے۔ لیکن یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ اور ہم اس وقت چونکے جب نسیم نے ہم کو ہلایا۔ لیکن اس چونکنے کے بعد ہی یہ حالت ہوئی کہ پیٹ میں چوہوں نے پکٹنگ کرنا شروع کر دی کہ ہم کس طرح یہ رومانی واقعہ نسیم کو سنا دیں لیکن اب ہم کو پس و پیش یہ تھا کہ

یہ راز ہے اور راز بھی کیسا راز جس کا تعلق راز و نیاز سے ہو، اس کو تو بس منجھلی بیگم سمجھیں یا ہم جانیں، کسی تیسرے کو تو کوئی حق ہی نہ پہنچتا تھا کہ وہ اس کو معلوم کرے مگر توبہ کیجیے! کس کافر سے منضبط ہو سکتا تھا۔ لاکھ لاکھ سوچا کہ یہ بری بات ہے مگر نتیجہ یہی ہوا کہ نسیم سے کہہ دیا۔ "ارے یار کچھ اور بھی سنا؟"

نسیم نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا؟"

ہم نے چپکے سے منجھلی بیگم کا نامۂ شوق ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے اس کو پڑھا اور پڑھ کر وہ سوال کیا جو بغیر پڑھے کرنا چاہیے تھا۔ کہنے لگے۔

"یہ کیا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "تم ہی بتاؤ۔"

کہنے لگے۔ "میں کیا جانوں۔"

ہم نے کہا۔ "اور واللہ ہم بھی کچھ نہیں جانتے۔"

ہنس کر کہنے لگا۔ "کیوں بنتے ہو؟"

ہم نے قسم کھا کر کہا۔ "واللہ ہم خود حیران ہیں کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ نہ ہم سے کسی منجھلی بیگم کی شناسائی نہ کچھ اور یہ خط آ پہنچا۔"

لاپروائی سے کہنے لگے۔ "دماغ پہ زور دو اور یاد کرو۔"

ہم نے جل کر کہا۔ "بھائی یہی کام بغیر تمہارے کہے تین گھنٹے سے کر رہا ہوں۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" اب انہوں نے بھی معاملہ کی نزاکت کو سمجھ لیا اور مدبّروں کی

طرح بیٹھ کر غور کرنے لگے۔ ادھر ادھر آنکھیں چلائیں، پیشانی پر شکنیں ڈالتے اور ہٹاتے رہے، لب زیریں کو ٹیڑھا کرتے دانتوں سے دبا لیا، کلمہ کی انگلی کو کنپٹی پر رکھا۔ ایک آدھ مرتبہ خود ہی "ہوں ہوں" کہا، سر کھجایا اور اسی طرح تھوڑا سا وقت گزارنے کے بعد ایک لمبی سی سانس کھینچ کر تالی بجائی اور کہنے لگے۔

"ہم سمجھ گئے۔"

ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیا؟"

کہنے لگے۔ "بس سمجھ گئے۔"

ہم نے زور دے کر کہا۔ "آخر کیا کچھ تو کہو۔"

کہنے لگے۔ "حقیقتہً یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ منجھلی بیگم کوئی خوش مذاق عورت ہیں اس نے تمہارے مضامین پڑھے ہیں، تمہارا کلام دیکھا ہے اور اب کہیں بے چاری نے تمہاری تصویر دیکھ لی ہے۔ یہ خط سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ تم کو اس مہمل طریقہ پر متوجہ کرنا چاہتی ہے اور پھانسنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ اگر تم اس طرح نہ پھنسے تو اس نے پالا مار لیا پھر تو وہ سب کچھ ضرور اگل دے گی لیکن اگر تم اس طرح نہ پھنسے تو وہ گونگی ہو جائے گی۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم نے کیا کیا؟"

ہم نے جو کچھ کیا تھا من و عن بتایا اس لیے نسیم کی گفتگو سے ہم کو اندازہ ہوا تھا اور پہلی مرتبہ اندازہ ہوا تھا کہ یہ شخص جس قدر نکتۂ لطیف سے بیگانہ نظر آتا ہے دراصل اسی قدر بیگانہ نہیں ہے بلکہ بڑا گہرا آدمی ہے۔ چنانچہ اس نے جو رائے

قائم کی تھی وہ ہمارے ذہن میں اتر گئی۔ ہمارے جواب کا مضمون سن کر نسیم نے کہا۔

"بس بہت ٹھیک ہے اب دیکھئے گا کہ وہ مسمات کاغذ پر کلیجہ نکال کر بھیجیں گی۔"

اس کے بعد ہمارے اور نسیم کے درمیان رسائل میں تصاویر چھپوانے کا تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ اس کے فوائد پر بحث ہوئی اور آخر کار یہ طے پایا کہ رسائل میں تصاویر کا شائع ہونا کبھی کبھی مفید بھی ہوتا ہے۔ ہم نے کہا۔

"مگر یار یہ تو بتاؤ کہ وہ میری کون سی غارت گر تصویر ہو سکتی ہے جس نے منجھلی بیگم کو بے قابو کر دیا۔"

کہنے لگے۔ "خدا جانے کس تصویر نے جادو کر دیا ہے، غالباً موج تبسم والی تصویر ہوگی۔ مگر نہیں وہ کیسے ہو سکتی ہے، اس میں تو میری تصویر بھی تھی۔ میرے خیال میں بحر تبسم کی تصویر نے اس غریب کو تباہ کیا ہے۔"

ہم نے کہا۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ یقیناً بحر تبسم کی تصویر کا اثر ہے۔"

اور ہم نے بحر تبسم والی تصویر پر تحقیقی نظریں ڈالیں۔ یہ تصویر آج سے پہلے ہم کو اس قدر دلکش کبھی نظر نہ آئی تھی لیکن اب جو ہم نے اس کو دیکھا تو وہ واقعی ایک قیامت تھی۔ منجھلی بیگم تو خیر پھر بھی ایک عورت ہے اور اس کے پاس ایک نرم دل ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر یہ تصویر خود ہماری نہ ہوتی تو آج ہم خود اس پر عاشق ہو گئے ہوتے۔ بہرحال یہ معاملہ گویا بالکل طے ہو گیا کہ اسی تصویر کو منجھلی بیگم نے دیکھا

ہے اور اسی تصویر نے اس غریب کا دل چھینا ہے۔

اب ہم تھے اور منجھلی بیگم کے مفصل نامۂ شوق کا انتظار۔ دنوں سے ہفتے ہو گئے مگر منجھلی بیگم کا کوئی خط نہ آیا۔ روزانہ دن میں دو چار مرتبہ نسیم سے منجھلی بیگم کا تذکرہ ہو جاتا تھا اور ہر مایوسی کے بعد ایک امید پیدا ہو جاتی تھی۔ کبھی تو خیال پیدا ہوتا تھا کہ کہیں جواب کے الفاظ سے منجھلی بیگم کے نازک دل کو ٹھیس تو نہیں لگ گئی۔ لیکن پھر ہم کہتے تھے کہ ہمارا جواب تو ایسا نہیں تھا اور واقعی ہم سوائے اس کے اور کیا جواب دیتے لیکن یہ جواب ہم کو پھر وہیں پر پہنچا دیتا تھا جہاں سے یہ سوال پیدا ہوا تھا۔ مگر جب اسی ادھیڑ بن میں دن گذر گئے تو رفتہ رفتہ یہ خیال بھی مٹنے لگا اور تھوڑے ہی دنوں میں منجھلی بیگم کی طرف سے لاپروائی سی پیدا ہو گئی بلکہ ایک حد تک ہم نے منجھلی بیگم کو بھلا ہی دیا۔

ہماری اہل خانہ کی رائے ہمارے متعلق یہ تھی کہ ہم نہایت نیک چلن واقع ہوئے ہیں۔ اس رائے کے دو پہلو بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم بد چلنی کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ دوسرے یہ کہ ہم میں صلاحیت تو ہے لیکن ہم ہیں شدت سے پاکدامن اور باعصمت واقع ہوئے ہیں۔ بہرحال ان دونوں پہلوؤں میں سے جو پہلو بھی ان کے پیش نظر ہو لیکن یہ واقعہ تھا کہ اگر کوئی ان کے سامنے ہمارے چال چلن کے متعلق ذرا بھی کچھ کہتا تو وہ اس کا منہ نوچ لیتیں اور ہمارے شکایت کرنے والے کی خود ہی شامت آ جاتی لیکن اس کا کیا علاج ہو کہ ان کو دستاویزی ثبوت مل چکا تھا۔ اور دھوبی کو کپڑے

دیتے وقت جب ہماری قمیض کی جیب سے منجھلی بیگم کا نامۂ شوق ملا تو ان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ہماری تمام عصمت مآبی ایک سراب ثابت ہوئی اور ہم ان کی نظروں میں سوائے دغاباز، بدچلن، آوارہ اور بدمعاش شوہر کے کچھ نہ رہ گئے۔ ہمارے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہ تھی کہ ہم بیگم کی نظروں میں نہ صرف مجرم بن چکے ہیں بلکہ ہمارے بیان کے بغیر ہم پر فردِ جرم بھی ثابت ہو گیا ہے۔ لیکن ہم جو گھر پہنچے تو نہ بیگم مسکراتی ہوئی دوڑیں نہ ان کی شیریں "خوش آمدید" نے ہم کو شوہرانہ فخر کا موقع دیا بلکہ ہم نے یہ دیکھا کہ ملازمہ تک ہم کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہی ہے اور بیگم کا کہیں پتہ نہیں۔ ہم نے دل میں کہا۔

"یا الٰہی خیر" اور ملازمہ سے پوچھا۔

"بیگم کہاں ہیں؟"

اس نے لاپروائی سے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا اور ہم سہمے ہوئے کمرے میں پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ بیگم مسہری پر لحاف میں چھپی ہوئی دراز ہیں۔ اور کمرے میں ایک سکوت کا عالم ہے۔ ہم نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ فلیٹ نہ لانے کا نتیجہ ہے۔ مچھروں کی کثرت نے بیچاری کو ملیریا میں مبتلا کر دیا لحاف کا کونا اٹھا کر دیکھا تو بیگم کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ اور بخار کی شدت سے رخساروں پر آنسو تھے۔ ہم نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیسی ہو بیگم؟"

مگر جواب ندارد۔ اور رخساروں پر بھی بخار کی کوئی علامت نہیں۔ ہم نے ہاتھ

پکڑ کر نبض ٹٹولی اور کہا۔ "کیا

"کیا حال ہے آخر کچھ کہو تو سہی۔ نبض تو ماشاء اللہ بالکل تندرستوں والی چل رہی تھی مگر بیگم نے کچھ اس طرح بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

"اچھی ہوں۔"

ہم اور پریشان ہو گئے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کا ہاتھ دبا کر کہا۔

"اچھی تو ہو مگر بتاؤ تو کہ طبیعت کیا ناساز ہے؟"

انہوں نے بجائے کوئی جواب دینے کے ہمارے زانو پر سر رکھ دیا اور سسک سسک کر رونا شروع کر دیا۔

اب ہم نے اپنے خاندان بھر کے تمام بیماروں کے نام لے لے کر پوچھنا شروع کیا کہ "وہ تو اچھے ہیں۔ وہ تو خیریت سے ہیں؟"

لیکن بیگم کی سسکیاں مع گرم آنسوؤں کے بڑھتی ہی جاتی تھیں اور پھر ستم یہ کہ وجہ نامعلوم اور تفصیلات کا انتظار۔ بیگم کے رونے پر کلیجہ پھٹا جاتا تھا اور اس رونے سے خدا جانے کیا کیا وہم دل میں سما کر جان لیے لیتے تھے۔

جب ہم نے زیادہ پوچھا تو بیگم نے ہمارا ہاتھ زور سے اپنے ہاتھوں سے دبایا۔ اور اس طرح آواز کے ساتھ رونا شروع کیا کہ ہم سٹپٹا کر مع جوتوں کے مسہری پر بیٹھ گئے۔ اور جاڑے کے موسم میں لگے بیگم کو دامن کی ہوا دینے۔ اب خود ہماری حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ بلکہ شاید ہم نے بھی بیگم کے ساتھ رونا شروع کر دیا تھا۔ بہرحال اتنا

رہم کو یاد ہے۔ جب بیگم کی سسکیاں ذرا دھیمی ہوئیں تو ہم نے اپنے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں کو بالکل برف کی طرح ٹھنڈا پایا اور جب بیگم نے اپنے آنسو ڈوپٹے سے پونچھے تو ہم کو بھی اپنے آنسوؤں کا خیال آیا جو خدا جانے کب سے جاری تھے۔ ہم نے موقع غنیمت جان کر کہا بیگم اپنے دل کو سنبھالو۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو خیر ہو ہی گیا مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے مگر یہ بتلاؤ کہ ہوا کیا۔

بیگم نے یہ سنتے ہی پھر سسکیاں بھرنا شروع کر دیں اور وہی حالت ہو گئی۔ جس سے ذرا سکون ہوا تھا۔ اب ہم نے مناسب یہی سمجھا کہ وجہ تو خیر بعد میں معلوم ہو جائے گی۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو سنبھالا جائے۔ لہٰذا ہم نے فوراً سرد پانی سے ان کا منہ دھلایا۔ تھوڑا سا پانی پلایا اور ان کو خاموش کر کے خود بھی ان کے سامنے اس لیے خاموش بیٹھ گئے کہ اگر ہم کچھ بولے تو ان کا غم پھر تازہ ہو جائے گا لیکن اس کیفیت میں بمشکل چند منٹ گزرے ہوں گے کہ خود بیگم نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"واہ ری قسمت ہم جس کو اپنا سمجھتے تھے وہ بھی اپنا نہیں ہے۔"

ہم نے تشفی آمیز لہجہ میں کہا۔

"خدا کو یاد کرو۔ اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے بس سب خدا کے ہیں۔"

بیگم نے چیخ مار کر روتے ہوئے کہا۔

جب آپ ہی میرے نہ ہے تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گی؟"

ہم نے جلدی سے گھبرا کر کہا۔

"نہیں نہیں۔ میں تو تمہارا ہوں یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ بیگم میں تمہارا..."

بیگم نے روتے ہوئے کچھ غضب ناک ہو کر کہا۔ "بس اب اس منہ سے یہ الفاظ نہ کہنا۔ مرد کی ذات میں وفا کا نام نہیں ہوتا۔

اب تو ہم بہت سٹپٹائے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے اور ہم نے کہا۔

"ارے بیگم آخر یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟

اسی طرح روتے ہوئے کہا۔

"بس بس اب اس طرح مجھے دھوکا نہ دو۔ جو تمہاری بیگم ہیں اپنی کو پیار سے بیگم کہو۔" ہم نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا کہا جو تمہاری بیگم ہیں... یعنی میری بیگم؟"

وہ غصے سے بولیں۔

"ہاں ہاں۔ تمہاری بیگم ایسے بھولپن سے پوچھ رہے ہیں جیسے کچھ جانتے ہی نہیں ہیں۔"

ہم نے اپنے دل میں کہا۔

"یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے۔" اور بیگم سے کہا۔

"خدا گواہ ہے۔ بیگم میں کچھ نہیں سمجھا۔" کہنے لگیں۔

یہ جھوٹی خدا کی گواہیاں کسی اور کو دو۔ مجھ کو تمہارے سب گن معلوم ہو گئے تم جھوٹے تمہاری محبت جھوٹی اور جو تم پر اعتبار کرے اسے کیا کہوں۔"

ہم۔ " بھئی خواہ مخواہ؟"

کہنے لگیں۔

"کیسے بے چارے معصوم بن رہے ہو۔ اور جب اپنی چہیتی کے پاس جاتے ہیں جب اس چڑیل سے نامہ پیام ہوتا ہے۔ جب اس ڈائن سے محبت جتائی جاتی ہے اس وقت یہ بھولا پن کہاں جاتا ہے۔"

"تم کچھ گھاس کھا گئی ہو کیا؟"

کہنے لگیں۔

" اچھا تو یہ بتاؤ وہ موا ہادی حسین کون ہے؟"

ہم نے کہا۔

" ہادی حسین؟"

ہم کو واقعی یاد نہیں تھا کہ ہادی حسین کون تھے۔ ہم نے کچھ غور کر کے کہا۔

"میں نہیں جانتا کون ہادی حسین؟"

کہنے لگیں۔

" اللہ رے تمہارا فریب۔ اب تک جھوٹ بول رہے ہو۔ اب تک بیوقوف بنا رہے ہو؟"

"آخر تم کو ہوا کیا ہے؟"

بیگم نے " یہ دیکھو" کہہ کر ہمارے سامنے وہی خط ڈال دیا جواب ہمارے ذہن میں بھی نہ تھا یعنی وہی مخملی بیگم والا خط۔ ہم نے اس کو پڑھا۔

" تسلیم۔ ہادی حسین آتے ہیں۔ ان کو کاغذ میں سب حال تحریر کر دیجئے ان کو کچھ معلوم نہیں ہے نہ کچھ کہئے گا۔ فقط۔"

یہ خط وہ تھا جس نے خود ہم کو اپنے متعلق بدگمان کر دیا تھا۔ اب ہم بیگم کی اس بدگمانی کو کس طرح رفع کرتے اور اپنے کو اس تحریری ثبوت کے بعد کس طرح بے گناہ ثابت کرتے۔ بس خط ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا اور ع -

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں -

لیکن ہم نے اپنی صفائی پیش کر دی۔

" یہ خط تمہارا خط ہے یعنی اس خط کے متعلق ہم کو اللہ قسم کچھ نہیں معلوم کہ یہ کس کا ہے؟"

بیگم نے سر ہلا کر کہا۔

" بجا ارشاد"

ہم نے پھر کہا۔

" اللہ جانتا ہے کہ اس خط کی لکھنے والی کو ہم نہیں جانتے۔"

بیگم نے کہا۔

"ہاں مگر اتنا جانتے ہیں کہ خط کی کوئی لکھنے والی ہے لکھنے والا نہیں ہے۔"

ہم:۔ یہ تو ہم نے اس خط لانے والے ہادی حسین سے پوچھ لیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ منجھلی بیگم نے بھیجا ہے۔

بیگم:۔ جی اور کیا وہ منجھلی بیگم جو ہیں انہوں نے یوں ہی اس بے چارے کو خط دیا ہے اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ سب حال تحریر کر دو اور خط لانے والے کو کچھ معلوم بھی نہیں ہے۔ اس لئے میں کہتی ہوں کہ اب تو جھوٹ نہ بولو۔ آخر اس سفید جھوٹ سے کیا فائدہ ہے؟

ہم:۔ بیگم تم کچھ بھی کہو مگر ہم ہیں بے قصور ویسے تو تمہارے شوہر ہیں جو چاہو کرو۔

بیگم:۔ بے شک بے شک آپ کے بے قصور ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ خط تک پکڑا گیا ہو۔

ہم نے کہا

"بیگم تمہاری جان کی قسم۔ اس خط کے متعلق مجھ کو خود کچھ نہیں معلوم ہے۔ بلکہ میں نے خود اس کا جواب یہی دیا ہے کہ میں اس خط کو کچھ نہیں سمجھا۔ آپ سمجھائیے تو سمجھوں کہ معمہ کیا ہے؟"

بیگم بولیں۔

"اچھا بس رہنے دو جلانے کو ایک تو چوری اس پر سینہ زوری مگر ہم نے آپ کو جس قدر نیک سمجھا تھا اسی قدر آپ تو بہت رنگیلے نکلے۔"

اب ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح بیگم کو یقین دلائیں۔ بات بجائے مٹنے کے بگڑتی جا رہی تھی اور بیگم کو کسی طرح اطمینان ہی نہ ہوتا تھا۔ ہم نے لاکھ لاکھ قسمیں کھائیں۔ لاکھ لاکھ ان کو یقین دلایا لیکن وہ تھیں کہ ہماری ہر قسم کو جھوٹ اور ہمارے ہر لفظ کو فریب ہماری ہر صفائی کو دغا بازی اور ہمارے ہر بیان کو چالاکی ہی سمجھ رہی تھیں۔ اب ان سے زیادہ ہماری حالت قابل رحم تھی۔ خیر وہ تو منہ پھیلائے ہوئے گویا اپنی تمام توقعات کا رونا رو رہی تھیں لیکن یہ تو ہم کہہ رہے تھے کہ تو ڈر نہیں لیکن خدا کے غضب سے ڈر۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو بیکار بیٹھے بٹھائے شامت آ گئی۔ اس منجھلی بیگم نے ہم کو کہیں کا بھی نہ رکھا خیر وہ تو خود نہ تھی لیکن اس نے بیٹھے بٹھائے ہم دونوں میاں بیوی کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی۔ کاش یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی جب اس واقعہ کی اصلیت بھی ہوتی۔ لیکن ہمارے یہاں تو گناہ بے لذت والا معاملہ تھا۔ خدا جانے آج کس کا منہ دیکھ کر اٹھتے تھے کہ گھر آ کر نہ کھانا نصیب ہوا نہ پانی بلکہ خون پانی ایک ہو کر رہ گیا۔ بیگم تھیں کہ مقاطعہ جوئی بھی کئے ہوئے تھیں اور ستیہ گرہ بھی لیکن ہم گویا حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا بھگت رہے تھے بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ گلے میں پھانسی کا پھندا پڑا ہوا ہے۔ اور دم نہیں نکل سکتا۔ تمام رات اس کشمکش میں گذاری۔ بیگم کی خوشامد کی۔ بیگم کو سمجھایا۔ بیگم سے محبت جتائی۔ بیگم کو بہلانے کی کوشش کی لیکن بیگم کیا تھیں گویا یہ

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی   ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اور ہم تھے کہ گویا ع

"دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔"

اسی طرح منہ لٹکائے ہوئے دفتر میں آکر بیٹھ گئے اور اس ناگہانی نشامت پر غور کرنے لگے۔ نسیم آئے تو ان سے افسانۂ غم کہا۔

انہوں نے سنتے ہی کہا۔

"ارے یار اس کا خط تو کل پھر آیا ہے۔"

ہم نے کہا۔

"جہنم میں ڈالو اس کو ایک خط نے تو یہ آفت برپا کی۔ اب دوسرا تو گھر ہی سے نکلوائے گا۔"

کہنے لگا۔

"نہیں تو وہ تمہاری بے گناہی کا ثبوت ہے۔"

ہم اچھل پڑے اور جھپٹ کر خط نسیم کے ہاتھ سے لے لیا۔

"تسلیم۔ آپ کچھ نہیں سمجھتے تو میں سمجھاتی ہوں کہ آپ کے اخبار سرپنچ میں جو وکیل صاحب کی شادی کا اشتہار نکلا ہے۔ ان کا پورا حال لکھ بھیج دیجیے۔ لیکن میں اس کو کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔ لہٰذا آپ بند لفافہ میں سب کچھ لکھ کر ہادی حسین کردے دیجیے۔ فقط"

ہم نے خط پڑھتے ہی کہا۔ لاحول ولا قوۃ۔

نسیم نے کہا۔ "آہا ہا ہا یہ اچھی دل لگی رہی۔"

اور ہم چھلانگیں مارتے ہوئے گھر میں جا کر بیگم کے اوپر مع خط کے گر پڑے اور کہا تو یہ دیکھو! اب تو یقین آئے گا۔

بیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کر لاپرواہی سے خط لے لیا۔ اور پڑھنے لگیں۔

لیکن ہم نے دیکھا کہ ان کے چہرے کا درہم اٹھنے لگا اور خط پڑھنے کے بعد انہوں نے پوچھا۔

"کیا کوئی شادی کا اشتہار چھپا تھا۔"

ہم نے کہا۔

"اور کیا یونہی یہ خط آیا ہے۔"

"یہ دیکھو اشتہار ہے۔" بیگم نے اشتہار دیکھ کر کہا۔

"توبہ اللہ مجھ کو کیا معلوم تھا کہ یہ بات ہے۔"

ہم نے ادائے دلبری سے کہا۔

"جی نہیں ہم تو بدچلن ہیں، بدمعاش ہیں، شہدے ہیں۔"

بیگم نے برا مان کر کہا۔ "خدا نہ کرے۔"

جیسے ہمارے دن پھرے خدا سب کے دن پھیرے۔